الرسالہ

زیر سرپرستی
مولانا وحید الدین خان
صدر اسلامی مرکز

نادان لوگ جس چیز کو پسپائی کہتے ہیں
دانش مند کے نزدیک وہ تیاری کا وقفہ ہے

دسمبر ۱۹۹۲ شمارہ ۱۹۳

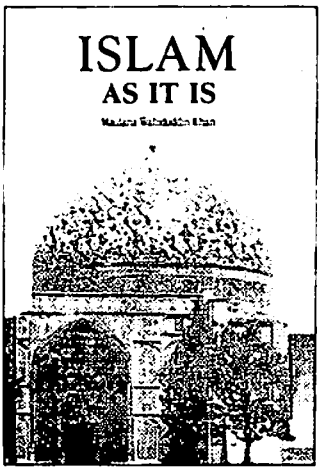

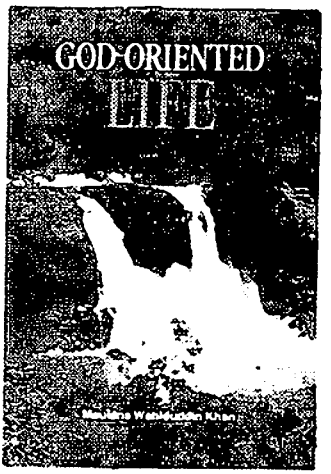

ISLAM AS IT IS

By Maulana Wahiduddin Khan

Pages 114 Rs. 40

In *Islam As It Is*, Maulana Wahiduddin Khan presents the fundamental teachings of Islam in a manner which will appeal directly to both general readers and students of Islam.

Simple and straightforward in style, *Islam As It Is* gives the reader an accurate and comprehensive picture of Islam — the true religion of submission to God.

GOD-ORIENTED LIFE

By Maulana Wahiduddin Khan

Pages 186 Rs. 60

The traditions – Sunnah – of the Prophet Muhammad, upon whom be peace, and the lives of his companions and those closely associated with them, serve as a major source of religious enlightenment in theory and in practice. This book endeavours to present these ideas in the simplest and most direct way. In that it culls from authentic sources the sayings and deeds of the Prophet and those inspired by him, it brings to us a complete and, above all, human picture of true Islamic behaviour.

بسم اللہ الرحمن الرحیم

الرسالہ

اردو، ہندی اور انگریزی میں شائع ہونے والا اسلامی مرکز کا ترجمان

دسمبر ۱۹۹۲ شمارہ ۱۹۳

اہل جنت	۴	تنقید و تحقیق	۱۷
خدا اور بندہ	۵	زندگی، موت	۱۸
آگ سے بچاؤ	۶	یہ فرق کیوں	۱۹
عجیب فرق	۷	جھوٹی مخالفت	۲۰
بصیرت کی اہمیت	۸	اجنبی دین	۲۱
داعی کا طریقہ	۹	دو قسم کے رہنما	۲۲
اذان اسپرٹ	۱۰	دعوتی عمل	۲۳
سامان آزمائش	۱۱	ربانی انسان	۲۴
حکمت کا طریقہ	۱۲	سبب اپنے اندر	۲۵
زلزلہ کا سبق	۱۳	ٹالرنس: فطرت کا اصول	۲۷
نرم انداز	۱۴	تنظیم	۳۰
فطرت کی طرف	۱۵	اصل مسئلہ	۳۲
سادہ کاغذ	۱۶	ایک سفر	۳۳
		خبرنامہ اسلامی مرکز	۴۸

AL-RISALA (Urdu) Monthly
1, Nizamuddin West Market, New Delhi - 110 013
Telephone : 697333, 611128
Fax : 91-11-3312601 (Attn : Tel. 697333)

اہلِ جنّت

جنت خدا کی انتہائی بامعنی تخلیق ہے۔ جنت ان قیمتی انسانوں کو دی جائے گی جو دنیا میں خدا کے سچے بندے بن کر رہے ہوں۔ جو لوگ دار الامتحان میں اعلیٰ زندگی گزاریں وہی دار الجزاء میں اعلیٰ قیام گاہ کے مستحق ٹھہریں گے۔

جنت اس نادر انسان کے لیے ہے جو غیب کی سطح پر حقیقت کا ادراک کرے۔ جو مفادات اور اعزازات سے بلند ہو کر زندگی گزارے۔ جو نہ دکھائی دینے والی چیزوں کو دیکھے۔ جو کھونے میں پانے کا راز دریافت کرے۔ جو ظاہر سے گزر کر باطن کو دیکھ سکے۔ جو انا رکھتے ہوئے اپنے آپ کو بے انا بنا لے۔

لوگ تعریف میں خوش ہوتے ہیں، جنت والا آدمی تنقید کا استقبال کرتا ہے۔ لوگوں کو اونچے مقام پر بیٹھنے میں لذت ملتی ہے، جنت والا آدمی اپنے آپ کو پیچھے بٹھا کر سکون محسوس کرتا ہے۔ لوگ چیزوں کو مفاد کے نقطۂ نظر سے دیکھتے ہیں، جنت والا آدمی ہر چیز کو اصول کی نظر سے دیکھتا ہے۔ لوگ اپنے کو نمایاں کرنے کے شائق ہوتے ہیں، جنت والا یہ چاہتا ہے کہ اپنے کو گمنامی کے گوشے میں چھپا لے۔

لوگ دوسروں کا احتساب کرنے کے لیے دوڑتے ہیں، جنت والا انسان اپنے احتساب کے لیے فکرمند رہتا ہے۔ لوگ دوسروں کی غلطی بتانے میں مہارت دکھاتے ہیں، جنت والا انسان اپنی غلطیوں کی تلاش میں گم رہتا ہے۔ لوگ ظاہری رونقوں میں جیتے ہیں، جنت والا انسان اندرونی حقائق کے سمندر میں غوطہ زن ہوتا ہے۔

لوگوں کی دل چسپی اس میں ہوتی ہے کہ وہ بولیں، جنت والا انسان چاہتا ہے کہ وہ ہمیشہ چپ رہے۔ لوگ چاہتے ہیں کہ دنیا ان کے کارناموں سے واقف ہو، جنت والا انسان چاہتا ہے کہ اس کا ہر کام دنیا کی نظر سے چھپا رہے۔ لوگ "شادم از زندگیٔ خویش کہ کارے کردم" کے احساس میں جیتے ہیں، جنت والا انسان اس احساس سے تڑپ اٹھتا ہے کہ میں تو کوئی ایسا کام نہ کر سکا جس کو میں رب العالمین کے سامنے پیش کر سکوں۔

اہلِ جنت کا کردار جنتی کردار ہوتا ہے، اہلِ جہنم کا کردار جہنمی کردار۔

خدا اور بندہ

علی بن ربیعہ کہتے ہیں کہ میں نے علی بن ابی طالب رضی اللہ عنہ کو دیکھا۔ ان کے پاس سواری کے لیے ایک جانور لایا گیا۔ جب انھوں نے اپنا پاؤں اس کے رکاب میں رکھا تو کہا بسم اللہ۔ پھر جب وہ اس کی پیٹھ پر بیٹھ گیے تو کہا الحمد للہ، سبحان الذی سخر لنا ھذا وما کنا لہ مقرنین وانا الی ربنا لمنقلبون۔ اس کے بعد انھوں نے تین بار اللہ کی حمد کی اور تین بار اللہ کی تکبیر کی۔ پھر کہا: سُبْحَانَكَ لَا اِلٰهَ اِلَّا اَنْتَ قَدْ ظَلَمْتُ نَفْسِیْ فَاغْفِرْلِیْ۔

راوی کہتے ہیں کہ اس کے بعد حضرت علی ہنس پڑے۔ میں نے پوچھا کہ اے امیر المومنین، آپ کس بات پر ہنسے۔ انھوں نے کہا کہ میں نے رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کو دیکھا ہے کہ آپ نے سوار ہوتے ہوئے وہی کہا جو میں نے کہا۔ پھر آپ ہنس پڑے۔ میں نے پوچھا کہ اے خدا کے رسول آپ کیوں ہنسے۔ آپ نے فرمایا:

یعجب الربُّ تبارك وتعالیٰ من عبدہ اذا قال ربِّ اغفرلی۔ ویقول علم عبدی انہ لا یغفر الذنوبَ غیری۔

(تفسیر ابن کثیر ۴/۱۲۴)

بندہ جب کہتا ہے کہ اے میرے رب، مجھے بخش دے تو اللہ تعالیٰ اس پر تعجب کرتا ہے اور خوش ہوتا ہے۔ وہ فرماتا ہے کہ میرے بندہ نے اس کو جانا کہ میرے سوا کوئی بھی گناہوں کو بخشنے والا نہیں۔

رَبِّ اغْفِرْلِیْ (میرے رب، مجھے بخش دے) کہنا کوئی سادہ سی بات نہیں۔ یہ ایک عظیم ترین دریافت کے نتیجہ میں نکلنے والا کلمہ ہے جو ایک مومن کی زبان سے نکل پڑتا ہے۔

یہ کلمہ کسی کی زبان سے اس وقت نکلتا ہے جب کہ وہ غیب کے پردے کو پھاڑ کر خدا کی موجودگی کو دریافت کرے۔ یہ آزادی کے باوجود اس بات کا اقرار ہے کہ میں اپنی آزادی کو بے قید استعمال کرنے کا حق نہیں رکھتا۔ یہ حشر کو دیکھے بغیر حشر کے واقعہ پر یقین لانا ہے۔ یہ اعمال کے اخروی نتائج کی حقیقت کا اس وقت اقرار کرنا ہے جب کہ ابھی وہ ظاہر نہیں ہوئے۔ یہ خدا کے ظہور سے پہلے خدا کے جلال و جبروت کے آگے جھک جانا ہے۔ یہ کلمہ معرفت کا کلمہ ہے، اور معرفت بلاشبہ اس دنیا کا سب سے بڑا عمل ہے۔

آگ سے بچاؤ

رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم مکہ سے ہجرت کرکے مدینہ پہونچے تو وہاں آپ نے سب سے پہلے ایک مسجد بنائی جو مسجد نبوی کے نام سے مشہور ہے۔ یہاں آپ نے جو پہلا جمعہ پڑھا، اس میں آپ نے خطبہ دیتے ہوئے فرمایا:

اے لوگو، اپنے لیے کچھ آگے بھیجو۔ جان لو کہ خدا کی قسم تم میں سے ہر شخص موت کا نشانہ بنے گا۔ پھر وہ اپنی بکریوں کو اس حال میں چھوڑ کر چلائے گا کہ ان کا کوئی چرواہہ نہ ہوگا۔ پھر اس کا رب اس سے کلام کرے گا اور وہاں کوئی ترجمان نہ ہوگا۔ اور نہ درمیان میں کوئی پردہ ہوگا۔ وہ فرمائے گا کہ کیا تمہارے پاس میرا فرستادہ نہیں آیا جس نے تم کو میرا پیغام پہونچایا۔ اور میں نے تم کو مال دیا اور تمہارے اوپر اپنا فضل کیا۔ پھر تم نے اپنے آگے کے لیے کیا بھیجا۔ بندہ اپنے دائیں اور بائیں دیکھے گا۔ مگر وہ کچھ نہ پائے گا۔ پھر وہ اپنے سامنے دیکھے گا۔ تو وہاں جہنم کے سوا اور کچھ نہ دیکھے گا۔ پس جو شخص اپنا چہرہ آگ سے بچا سکے وہ بچائے، خواہ کھجور کے ایک ٹکڑے کے ذریعہ کیوں نہ ہو (البدایۃ والنہایۃ، ۳/۲۱۴)

آدمی کے اندر موت اور قیامت کے مسئلہ کا شدید احساس پیدا ہو جائے تو وہ چاہنے لگتا ہے کہ جو بھی قیمت وہ دے سکتا ہے، اس کو دے کر وہ اپنے آپ کو آخرت کے عذاب سے بچائے۔

رات کے وقت وہ بستر پر لیٹا ہوا ہے۔ آخرت کے مسئلہ کو سوچ کر وہ تڑپ اٹھتا ہے۔ وہ اٹھ کر وضو کرتا ہے اور نماز کے لیے کھڑا ہو کر کہتا ہے کہ خدایا، میری اس نماز کو میری طرف سے قبول کرلے اور مجھے آگ کے عذاب سے بچالے۔ وہ ایک شخص کو مصیبت میں دیکھتا ہے، وہ اپنی محنت کی کمائی کا ایک حصہ اس کو دیتا ہے اور اس کا دل کہہ رہا ہوتا ہے کہ خدایا، آج میں نے جس طرح اس کی مدد کی ہے، تو آنے والے سخت تر دن میں میری مدد فرما۔ ایک حق اس کے سامنے ظاہر ہوتا ہے۔ وہ اپنی پوزیشن کا خیال کیے بغیر اس کا اعتراف کرلیتا ہے اور آنسوؤں کی زبان سے کہتا ہے کہ خدایا، مجھے اپنے ان بندوں میں لکھ لے جنھوں نے دیکھے بغیر تیرا اعتراف کیا۔

ہر عمل کھجور کا ایک ٹکڑا ہے، اور جس آدمی کے پاس جو ٹکڑا ہے، اس کو چاہیے کہ اسی ٹکڑے کو وہ اپنی نجات کے لیے پیش کرے۔

عجیب فرق

رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم مکہ سے طائف کی طرف جا رہے تھے۔ درمیان میں آپ کا گزر ایک ایسے راستے سے ہوا جو بظاہر دشوار اور تنگ تھا۔ آپ نے پوچھا کہ اس راستے کا نام کیا ہے۔ لوگوں نے کہا کہ الضیقہ (تنگ)۔ آپ نے فرمایا کہ نہیں، وہ تو الیسریٰ (آسان) ہے :

ثم سلك في طريق يقال لها الضَّيقه۔ فلما توجه فيها رسول الله صلى الله عليه وسلم سأل عن اسمها۔ فقال: ما اسمُ هٰذهِ الطريق۔ فقيل له الضيقة۔ فقال: بل هي اليُسرىٰ (سیرۃ ابن ہشام، ۴/ ۱۲۷)

حضرت علیؓ کے یہاں پہلا لڑکا پیدا ہوا تو انھوں نے اس کا نام حرب (جنگ) رکھا۔ رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کو معلوم ہوا تو آپ نے اس کو ناپسند فرمایا اور اس کا نام حسن رکھا۔ حضرت علیؓ کے یہاں دوسرے لڑکے کی پیدائش ہوئی تو دوبارہ انھوں نے اس کا نام حرب رکھنا چاہا۔ آپ نے دوبارہ انھیں اس سے منع کر دیا اور لڑکے کا نام حسین تجویز کیا۔ ایک بار آپ کی ملاقات ایک شخص سے ہوئی۔ آپ نے ان کا نام پوچھا۔ انھوں نے کہا کہ حزن (غم)۔ آپ نے فرمایا: بل انت سهل (نہیں تمہارا نام تو آسان ہے)

رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کا گزر ایک قبیلہ پر ہوا۔ آپ نے پوچھا کہ تم کون لوگ ہو۔ انھوں نے کہا بنو غیان (گمراہوں کی اولاد) آپ نے فرمایا: بل انتم بنو رشدان (بلکہ تم ہدایت یافتہ لوگوں کی اولاد ہو) غزوۂ ذی قرد کے سفر میں آپ کا گزر ایک کنویں سے ہوا۔ آپ نے کنویں کا نام پوچھا۔ لوگوں نے بتایا کہ بئسان (کھاری) آپ نے فرمایا کہ نہیں۔ بلکہ اس کا نام نعمان (عمدہ) ہے۔

موجودہ دنیا میں ہر چیز کا ایک تاریک پہلو ہوتا ہے، اور دوسرا اس کا روشن پہلو۔ رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کا طریقہ یہ تھا کہ آپ ہمیشہ چیزوں کے تاریک پہلو کو نظر انداز کر کے صرف اس کے روشن پہلو کو دیکھتے تھے اور لوگوں کو اسے دکھاتے تھے۔ موجودہ زمانہ کے مسلم رہنماؤں کا طریقہ اس کے بالکل برعکس ہے۔ وہ چیزوں کے صرف تاریک رُخ کو دیکھ پاتے ہیں، اس کا روشن رخ ہمیشہ ان کی نگاہوں سے اوجھل رہتا ہے۔ اس کے باوجود وہ سمجھتے ہیں کہ وہ پیغمبرِ اسلامؐ کے امتی ہیں۔

بصیرت کی اہمیت

آپ صحیح البخاری کھولیں تو اس کی پہلی حدیث وہ ملے گی جس کو عمر بن الخطاب رضی اللہ عنہ نے منبر پر بیان کیا تھا۔ اس کا پہلا فقرہ ہے: اِنَّمَا الْاَعْمَالُ بِالنِّیَّات (بے شک عمل کا دارومدار نیت پر ہے)

پھر اسی صحیح البخاری میں، مثال کے طور پر، بکتاب الوضوء، باب البول قائماً وقاعداً کے تحت ایک روایت یہ ہے کہ رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم ایک گروہ کے کوڑا خانہ پر گیے۔ پھر آپ نے کھڑے ہو کر پیشاب کیا (اتی النبیُّ صلی اللہ علیہ وسلم سُبَاطَةَ قَوْمٍ فَبَالَ قَائِمًا)

اب ایک شخص ہے جو پہلی حدیث کو لے کر اس پر تقریر کرتا ہے اور لوگوں سے کہتا ہے کہ خالص اللہ کے لیے عمل کرو، اگر تم اللہ کی رضا کے سوا کسی اور چیز کو مقصود بناؤ گے تو تمہارا سارا عمل اکارت ہو جائے گا۔ آخرت میں اسی عمل کی قیمت ہے جو خالص اللہ کی خوشنودی کے لیے کیا گیا ہو۔

دوسرا شخص وہ ہے جو صرف دوسری حدیث کو لے لیتا ہے۔ وہ لوگوں کے اندر اس بات کی مہم چلاتا ہے کہ لوگ کھڑے ہو کر پیشاب کریں۔ کیوں کہ رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم نے ایسا کیا ہے۔

بظاہر یہ دونوں آدمی حدیث پر عمل کر رہے ہیں۔ مگر اس ظاہری مشابہت کے باوجود پہلا آدمی صحیح ہے اور دوسرا آدمی غلط۔ کیوں کہ پہلا آدمی ایک ایسی تعلیم کی اشاعت کر رہا ہے جو عمومی حیثیت رکھتی ہے۔ اس تعلیم کی جتنی بھی اشاعت کی جائے اس سے دین میں کوئی نقص واقع نہ ہوگا۔ مگر دوسرے آدمی کا معاملہ اس سے مختلف ہے۔ وہ ایک اتفاقی واقعہ کو کلی اور عمومی حیثیت دے رہا ہے۔ ایسا شخص فتنہ کا داعی ہے نہ کہ دین کا داعی۔

اس مثال سے اندازہ ہوتا ہے کہ دین کا کام کرنے کے لیے صرف دینی معلومات کافی نہیں، اسی کے ساتھ دینی بصیرت بھی انتہائی طور پر ضروری ہے۔ اسی لیے کہا گیا ہے کہ ایک من علم کے لیے دس من عقل کی ضرورت ہوتی ہے (یک من علم را دہ من عقل می باید)

دینی علم کو دینی بصیرت بنانے کا راز تقویٰ ہے۔ جو آدمی تقویٰ اور خشیت والا ہوگا اس کا علم اپنے آپ بصیرت کی صورت میں ڈھل جائے گا۔

داعی کا طریقہ

اخرج احمد عن رجل من بنی مالك بن كنانة قال: رأيت رسول الله صلى الله عليه وسلم بسوق ذي المجاز يتخللها يقول: يا ايها الناس قولوا لا اله الا الله تفلحوا۔ قال وابوجهل يحثي عليه التراب ويقول لا يغويتكم هذا عن دينكم فانما يريد لتتركوا الهتكم وتتركوا اللات والعزى۔ وما يلتفت اليه رسول الله صلى الله عليه وسلم

(۱/ ۱۰۸)

امام احمد نے نقل کیا ہے کہ بنو مالک بن کنانہ کے ایک شخص نے کہا کہ رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کو میں نے (ہجرت سے پہلے) ذوالمجاز کے بازار میں دیکھا تھا۔ آپ ان کے درمیان چل رہے تھے اور یہ کہہ رہے تھے کہ اے لوگو، کہو کہ اللہ کے سوا کوئی معبود نہیں، تم فلاح پاؤ گے۔ راوی کہتے ہیں کہ ابوجہل بھی آپ کے ساتھ تھا۔ وہ آپ پر مٹی پھینک رہا تھا اور یہ کہتا جاتا تھا کہ لوگو، یہ شخص تم کو تمہارے دین سے بہکا نہ دے۔ وہ چاہتا ہے کہ تم لوگ اپنے معبودوں کو چھوڑ دو اور لات اور عزیٰ کو ترک کر دو۔ مگر میں نے دیکھا کہ رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم ابوجہل کی طرف کوئی توجہ نہیں فرما رہے ہیں۔

رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کے اس واقعہ سے معلوم ہوتا ہے کہ داعی کا طریقہ کیا ہے۔ جب ایک شخص لوگوں کو اللہ کے سچے دین کی طرف بلانے کے لیے اٹھتا ہے تو وہ لوگ اس کے دشمن بن جاتے ہیں جو جھوٹے دین پر کھڑے ہوئے تھے۔ وہ اس کا مذاق اڑاتے ہیں۔ طرح طرح سے اس کو تکلیف پہنچاتے ہیں۔ مگر داعی پر لازم ہے کہ وہ ان کی طرف التفات نہ کرے۔ وہ ان کی ایذا رسانی سے اعراض کرتے ہوئے اپنا دعوتی کام جاری رکھے۔

ابوجہل کی شرانگیزی کے مقابلہ میں رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کا مذکورہ رویہ نعوذ باللہ بزدلی کی بنا پر نہ تھا۔ بلکہ وہ عین بہادری تھا۔ اسی بہادرانہ کردار کا نام صبر و اعراض ہے۔ صبر و اعراض دعوت کی لازمی قیمت ہے۔ جو شخص صبر و اعراض کا ثبوت نہ دے، وہ دعوتِ حق کا کام بھی انجام نہیں دے سکتا۔

اذان اسپرٹ

روی عن انس بن مالك رضی الله عنه قال: قال رسول الله صلی الله علیه وسلم۔ اذا أُذِن فی قریةٍ آمَّنَهَا اللهُ عزوجل من عذابه ذٰلك الیوم (الترغیب والترتیب، بحوالہ طبرانی)

انس بن مالک رضی اللہ عنہ کہتے ہیں کہ رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ جب کسی بستی میں اذان دی جائے تو اللہ تعالیٰ اس بستی کو اس کے اس دن کے عذاب سے بچالیتا ہے۔

اس حدیث میں اذان دینے سے مراد صرف اس کی لفظی پکار نہیں ہے، بلکہ وہ پکار ہے جس میں اذان کے الفاظ محض بطور الفاظ نہ پکارے جائیں بلکہ وہ ایک ربانی حقیقت کے اعلان کے طور پر پکارے گئے ہوں۔

اذان کے الفاظ محض الفاظ نہیں ہیں۔ اس کا ہر فقرہ ایک اسپرٹ کو بتارہا ہے۔ اس کو ایک لفظ میں "اذان اسپرٹ" کہا جاسکتا ہے۔ جس بستی میں اذان پکاری جائے، وہ باعتبار حقیقت، اس بات کا اعلان ہے کہ ـــــــ ہم وہ لوگ ہیں جو اذان کو ماننے والے ہیں، ہم اذان اسپرٹ کے ساتھ اس دنیا میں رہنا چاہتے ہیں۔ اور جو بستی اذان اسپرٹ والی بستی بن جائے، وہ یقیناً دنیا اور آخرت کے عذاب سے محفوظ ہوجائے گی۔

مثلاً اذان میں سب سے زیادہ جو کلمہ دہرایا جاتا ہے وہ اللہ اکبر (اللہ بڑا ہے) کا کلمہ ہے۔ اس کلمہ کی اسپرٹ کیا ہے۔ اس کلمہ کی اسپرٹ تواضع ہے۔ اس کلمہ کی اسپرٹ یہ ہے کہ "اللہ بڑا ہے، انسان چھوٹا ہے"۔ جو لوگ اس اذان اسپرٹ کو اپنالیں، حتی کہ وہ اعلان کرکے دوسروں کو بتادیں کہ ہم اذان اسپرٹ کے حامل لوگ ہیں۔ وہ یقینی طور پر اس عذاب سے بھی محفوظ ہوجائیں گے جو انسانوں کی طرف سے آتا ہے اور اس عذاب سے بھی جو فرشتوں کے ذریعہ انسان کے اوپر ڈالا جاتا ہے۔

جو لوگ اللہ کو بڑا مان کر چھوٹے بن گیے ہوں وہ ایسے لوگ ہوں گے جو ظلم اور سرکشی اور عناد اور بدخواہی اور حق تلفی سے خالی ہوں گے۔ جن لوگوں کے اندر یہ خصوصیات پیدا ہوجائیں وہ لوگوں کے درمیان محبوب بن جائیں گے۔ اس کے بعد کون ہوگا جو انھیں ستائے۔

سامان آزمائش

امتحان ہال میں ہزاروں قسم کے پرچے رکھ دیے جائیں اور طالب علموں سے کہا جائے کہ جو طالب علم خود سے جتنا پرچہ اٹھالے گا اتنا ہی امتحان اس کو دینا ہوگا۔ اگر ایسا کیا جائے تو کوئی بھی طالب علم بہت سے پرچوں کو نہیں اٹھائے گا۔ ہر طالب علم یہ چاہے گا کہ وہ کم سے کم پرچہ کو اٹھائے بلکہ اگر ممکن ہو تو ایک ہی پرچہ اپنے ہاتھ میں لے تاکہ اس کا امتحان آسان رہے۔

مگر ایک اور شدید تر امتحان میں تمام طالب علموں کا طریقہ اس سے مختلف ہے۔ یہاں امتحان ہال میں داخل ہونے والا ہر طالب علم یہ چاہتا ہے کہ وہ زیادہ سے زیادہ پرچے اٹھالے۔ حتیٰ کہ اگر ممکن ہو تو سارے ہی پرچوں پر تنہا قابض ہو جائے۔

یہ دوسرا امتحان ہال موجودہ دنیا ہے۔ دنیا کے بارہ میں اللہ نے اور اس کے رسولوں نے بار بار یہ اعلان کیا ہے کہ یہ دنیا انسانوں کے لیے امتحان گاہ ہے۔ یہاں جو کچھ کسی کو ملتا ہے یا جو کچھ کوئی شخص حاصل کرتا ہے وہ سب اس کے لیے برائے امتحان ہے۔ کامیاب وہ ہے جو اس امتحان میں پورا اترے ورنا کام وہ ہے جو اس امتحان میں ناکام ہو جائے۔

یہ احساس اگر فی الواقع لوگوں کے اندر زندہ ہو تو وہ دنیا کی چیزوں کو حاصل کرنے میں انتہائی حد تک محتاط رہیں گے۔ وہ چاہیں گے کہ ان کا اثاثہ سب سے کم ہو تاکہ انھیں امتحان کے وقت کم سے کم حساب دینا پڑے۔

اگر آدمی اس حقیقت کو اچھی طرح سمجھ لے تو اس کا حال یہ ہو جائے گا کہ اس کو اگر تقسیم معاش میں زیادہ ملے گا تب بھی وہ اس کا کم سے کم حصہ اپنی ذات پر خرچ کرے گا۔ اور اس کا زیادہ حصہ اللہ کی راہ میں دے دے گا۔ وہ اپنی حاصل شدہ کمائی کو بھی اپنی ذات یا اپنی نمود و نمائش میں خرچ کرتے ہوئے ڈرے گا۔ وہ بقدر ضرورت اپنے پاس رکھ کر بقیہ کو خیر کی مدوں میں استعمال کرے گا تاکہ قیامت کے دن اس کا بوجھ ہلکا رہے۔ دنیا کے امتحان ہال میں آدمی کم سے کم پرچہ لینا چاہتا ہے اور آخرت کے امتحان ہال میں زیادہ سے زیادہ۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ آدمی ایک پرچہ کو ذمہ داری سمجھتا ہے اور دوسرے کے بارہ میں اس کو احساس نہیں کہ وہ ذمہ داری ہے نہ کہ کوئی حق۔

حکمت کا طریقہ

اس دنیا میں بے نزاع زندگی ممکن نہیں۔ آپ خواہ اپنوں کے درمیان رہتے ہوں یا غیروں کے درمیان، بہرحال آپ کے اور دوسروں کے بیچ میں نزاع کی صورتیں پیدا ہوں گی۔ ان نزاعات کی پیدائش کو آپ روک نہیں سکتے۔ البتہ آپ یہ کر سکتے ہیں کہ پہلے ہی مرحلہ میں نزاع کو ختم کر کے اس کے برے انجام سے اپنے آپ کو بچالیں۔

کبھی نظر انداز کرنے کی پالیسی ہی نزاع کو ختم کرنے کے لیے کافی ہوتی ہے۔ کوئی شخص آپ کے خلاف اشتعال انگیز کلمات کہتا ہے۔ اس کا کامیاب ترین جواب یہ ہے کہ آپ اس کی اشتعال انگیزی پر مشتعل نہ ہوں۔ اس طرح آپ پیدا شدہ نزاع کو پہلے ہی مرحلہ میں کچل دیں گے۔

کبھی ایسا ہوتا ہے کہ نزاع پیدا کرنے والا آپ کی عزت کو ٹھیس پہنچاتا ہے۔ وہ آپ کے لیے وقار کا مسئلہ کھڑا کر دیتا ہے۔ یہاں بھی وقار کے تحفظ کی بہترین تدبیر یہ ہے کہ اس کی کوئی تدبیر نہ کی جائے۔ آپ یہ سوچ کر خاموش ہو جائیں کہ عزت کو دینے والا بھی خدا ہے اور عزت کو چھین لینے والا بھی خدا ہے۔ پھر اس کے لیے میں ایک انسان سے کیوں الجھوں۔ آپ کا یہ رویہ نزاع کو ختم کرنے کے لیے کافی ہو جائے گا۔

کبھی نزاع کے ساتھ فائدہ اور نقصان کا پہلو وابستہ ہو جاتا ہے۔ بظاہر ایسا معلوم ہوتا ہے کہ اگر صبر و اعراض کی پالیسی اختیار کی گئی تو وہ مادی نقصان کا سبب بن جائے گی۔ مگر یہ سوچ درست نہیں۔ اس طرح کے معاملہ میں اصل انتخاب نقصان اور بے نقصان کے درمیان نہیں ہوتا، بلکہ کم نقصان اور زیادہ نقصان کے درمیان ہوتا ہے۔ ایسے معاملات میں نزاع کو پہلے مرحلہ میں ختم کرنا کم نقصان کا راستہ ہے اور نزاع کو بڑھانا زیادہ نقصان کا راستہ۔ پھر کیوں نہ آدمی زیادہ نقصان کے راستہ کو چھوڑ کر کم نقصان والے راستہ کو اختیار کرلے۔

ہم نزاع کی پیدائش کو روک نہیں سکتے۔ البتہ یہ یقینی طور پر ہمارے اختیار میں ہے کہ اعراض کا طریقہ اختیار کر کے اپنے آپ کو نزاع کے فتنہ سے بچالیں۔ ہم زیادہ نقصان کے مقابلہ کم نقصان کو گوارا کرلیں۔

زلزلہ کا سبق

قدرتی آفتوں میں سب سے بڑی آفت زلزلہ ہے۔ قدیم ترین زمانہ سے انسان زلزلوں کا شکار ہوتا رہا ہے۔ زلزلہ میں جو انسانی موتیں واقع ہوتی ہیں، ان کا سب سے بڑا سبب مکانوں کا گرنا ہے۔ جب زلزلہ کا جھٹکا آتا ہے تو مکانات اچانک گر پڑتے ہیں اور چھوٹے بڑے سب اس کے نیچے دب کر مر جاتے ہیں۔ انسان نے اپنے تجربات میں یہ معلوم کیا کہ جو مکان جتنا زیادہ مضبوط ہو، اتنی ہی آسانی سے وہ زمیں بوس ہو جاتا ہے اور بھیانک حادثات کا سبب بنتا ہے۔ اس سے یہ نتیجہ اخذ کیا گیا کہ زلزلہ سے پیدا ہونے والے نقصانات سے بچنے کی تدبیر مکانات کی "مضبوطی" نہیں بلکہ اس کی "کمزوری" ہے۔ مضبوط مکان بے لچک ہوتا ہے، وہ زلزلہ کے مقابلہ میں مستحکم طور پر کھڑا رہنا چاہتا ہے۔ چوں کہ شدید زلزلہ کا جھٹکا ہر مضبوط مکان سے بہت زیادہ ہوتا ہے، اس لیے مکان کی مضبوطی اس کے لیے الٹی پڑتی ہے۔ وہ پورا کا پورا دھڑام سے گر جاتا ہے۔

اس کے برعکس مکان اگر زیادہ مضبوط نہ ہو بلکہ لچک دار ہو تو اس کے اندر زلزلہ کے جھٹکے کو سہارنے کی طاقت آجاتی ہے۔ زلزلہ جب جھٹکا دیتا ہے تو وہ خود بھی ہلنے لگتا ہے۔ اس طرح مکان کا ہلنا اس کو گرنے سے بچا لیتا ہے۔ زلزلہ اگر زمین کو تلپٹ نہ کرے، بلکہ صرف ہلائے، تو ایسے مکانات اکثر محفوظ رہتے ہیں اور اسی کے ساتھ ان مکانوں کے باشندے بھی۔

اس تجربہ کی روشنی میں ارتھ کوئیک انجینیرنگ وجود میں آئی ہے۔ اس انجینیرنگ کے مطابق، زلزلہ کے علاقوں میں ایسے مکانات بنائے جاتے ہیں جن کا ڈھانچہ فلوٹنگ فاؤنڈیشن (floating foundation) کے اصول پر بنایا جاتا ہے۔ چنانچہ جب زلزلہ کا جھٹکا آتا ہے تو ایسا مکان ہل کر رہ جاتا ہے، وہ منہدم نہیں ہوتا۔ ۱۹۸۹ میں سان فرانسکو میں شدید زلزلہ آیا۔ مگر وہاں صرف ۲۷۵ موتیں ہوئیں۔ جب کہ جون ۱۹۹۰ میں اسی قسم کا زلزلہ شمالی ایران میں آیا تو ۶۰ ہزار آدمی مر گئے۔ اس فرق کا سبب یہ تھا کہ سان فرانسکو میں لچک دار مکانات بنے ہوئے تھے اور ایران میں اینٹ اور سمنٹ کے مضبوط مکانات۔

یہ قدرت کا ایک سبق ہے جو بتاتا ہے کہ موجودہ حادثات کی دنیا میں بچنے کی تدبیر کیا ہے۔ وہ تدبیر یہ ہے کہ آدمی اس دنیا میں اکڑ کے ساتھ نہ رہے بلکہ تواضع کے ساتھ رہے۔

نرم انداز

امام بخاری نے حضرت جابر بن عبداللہ ؓ کے واسطہ سے نقل کیا ہے کہ رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم نے فرمایا : اللہ اس آدمی پر رحم کرے جو خریدنے اور بیچنے اور تقاضا کرنے کے وقت نرمی برتتا ہے (رحم اللہ رجلاً سمحًا اذا باعَ واذا اشتری واذا اقتضی، مشکاۃ المصابیح، الجزء الثانی، صفحہ ۸۵۰)

اس حدیث میں اصلاً آخرت کا معاملہ بتایا گیا ہے۔ یعنی جو تاجر ایسا کرے کہ وہ لوگوں کے ساتھ خرید و فروخت کے وقت نرمی کا معاملہ کرے۔ کسی کے ذمہ اس کا بقایا ہو تو نرمی اور شرافت کے ساتھ اس کا تقاضا کرے تو آخرت میں اللہ تعالیٰ اس کے ساتھ رحم کا معاملہ فرمائے گا۔ چنانچہ ایک اور حدیث میں ہے کہ ایک شخص لین دین میں لوگوں سے درگذر کا سلوک کرتا تھا۔ جب آخرت میں اس کا معاملہ پیش ہوا تو اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ میرے بندے سے درگذر کرو، کیوں کہ میں اس قسم کے سلوک کا زیادہ حق رکھتا ہوں (فقال اللہ تعالیٰ انا احق بذا منك، تجاوزوا عن عبدی)

تاہم اسلام میں دنیا اور آخرت الگ الگ نہیں ہیں۔ جو چیز آخرت کے اعتبار سے مفید ہے، اسی میں دنیا کا فائدہ بھی پوری طرح رکھ دیا گیا ہے۔

ایک بار میں نے ایک کامیاب دکاندار سے پوچھا کہ کاروبار میں کامیابی کے لیے کیا چیز ضروری ہے۔ اس نے جواب دیا : نرم بات۔ یہ عین وہی چیز ہے جو حدیث میں بتائی گئی ہے۔

اگر دنیا میں صرف کوئی ایک دکاندار ہوتا تو اس کو نرمی کا انداز اختیار کرنے کی ضرورت نہ ہوتی۔ اس کو اجارہ داری حاصل رہتی اور ہر شخص اپنی ضرورت سے مجبور ہوتا کہ ہر حال میں اسی سے سودا خریدے۔ مگر دنیا میں بے شمار دکانیں کھلی ہوئی ہیں۔ اب ایک شخص جس کی جیب میں قیمت ہے، وہ آپ ہی سے خریداری کیوں کرے گا۔ یہاں آپ کو یہ کرنا ہے کہ گاہک کی ضرورت کا مال دینے کے ساتھ اس کو اپنے نرم اخلاق سے خوش کریں۔ حتی کہ اگر وہ کسی وجہ سے سخت رویہ اختیار کرے تب بھی آپ اس کے ساتھ نرم سلوک کو نا نہ چھوڑیں۔

موجودہ دنیا میں تجارتی کامیابی کا سب سے بڑا راز یہی ہے۔ نرم انداز آدمی کو کامیابی کی طرف لے جاتا ہے اور سخت انداز ناکامی کی طرف۔

فطرت کی طرف

نفسیات کے ایک عالم نے کہا کہ تم ہر جگہ اپنے دوست پا سکتے ہو۔ مگر تم ہر جگہ اپنے دشمن نہیں پا سکتے۔ دشمن تم کو خود بنانا پڑے گا :

You can meet friends everywhere but you cannot meet enemies everywhere - you have to make them.

یہ بات نہایت درست ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ دوستی معمول کی حالت ہے، اور دشمنی ایک خلاف معمول حالت۔ دو آدمی سادہ طور پر ایک ساتھ رہیں تو ان کی فطرت انھیں دوستی ہی کی طرف رہنمائی کرتی ہے۔ دشمنی ہمیشہ اس وقت شروع ہوتی ہے جب دونوں میں سے کوئی شخص ناگوار قول یا عمل کے ذریعہ دوسرے شخص کو بھڑکا دے۔

جب بھی کسی کے ساتھ آپ کی دشمنی قائم ہو جائے تو اس کو مستقل نہ سمجھ لیجئے۔ فطرت کے قانون کے مطابق، دوستی کی حالت مستقل حالت ہے نہ کہ دشمنی کی حالت۔ آپ وقتی حالت کو دوبارہ مستقل حالت کی طرف لے جانے کی کوشش کیجئے۔ آپ یقیناً کامیاب ہوں گے، بشرطیکہ آپ نے اس کے لیے حکیمانہ طریقہ اختیار کیا ہو۔

دوستی کی حالت چونکہ مستقل انسانی حالت ہے، اس لیے جب کوئی شخص دشمنی سے دوستی کی طرف جانا چاہے تو فطرت کا پورا نظام اس کے ساتھ رہتا ہے۔ ایسی کوشش میں وہ تنہا نہیں ہوتا بلکہ اپنے باہر کی پوری دنیا کو وہ اپنا ہم نوا بنا لیتا ہے۔ اور جس آدمی کی ہم نوا پوری کائنات ہو جائے اس کے لیے ناکامی کا کوئی سوال نہیں۔

اس دنیا میں سب سے طاقت ور چیز فطرت ہے۔ کسی چیز کی جو فطرت اس کے خالق نے لکھ دی ہے اس سے ہٹنا اس کے لیے ممکن نہیں۔ جمادات، نباتات، حیوانات، سب کے سب اپنی مقرر کی ہوئی فطرت پر چلتے ہیں، وہ کبھی اس سے نہیں ہٹتے۔

یہی حال انسان کا ہے۔ انسان کے اندر بھی سب سے زیادہ طاقت ور چیز اس کی فطرت ہے۔ آپ اگر فطرت کا اسلوب اختیار کریں تو آپ سرکش ترین انسان کو بھی مسخر کر سکتے ہیں۔

سادہ کاغذ

رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کے زمانہ میں جو واقعات پیش آئے، ان میں سے ایک واقعہ وہ ہے جو حدیبیہ کی نسبت سے مشہور ہے۔ یہ واقعہ ۶ھ میں پیش آیا۔ رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم اپنے ۱۴ سو اصحاب کے ساتھ سفر کرتے ہوئے جب مکہ کے قریب حدیبیہ میں پہنچے تو آپ کی اونٹنی بیٹھ گئی۔ آپ نے فرمایا کہ اونٹنی کو اس ہستی نے روک دیا ہے جس نے ابرہہ کے ہاتھیوں کو روک دیا تھا۔ آپ وہیں ٹھہر گیے اور فرمایا:

لاتدعوني قريش اليوم الى خطة يسألونني فيها صلة الرحم الا اعطيتهم اياها۔ سیرۃ ابن ہشام ۳/ ۳۵۸، البدایہ والنہایہ ۴/۱۶۵، الکامل فی التاریخ لابن اثیر ۲/ ۲۰۰

قریش آج مجھے جس چیز کی بھی دعوت دیں جس میں کہ صلہ رحمی ہو تو میں ضرور وہ چیز انھیں دوں گا۔

اس کے بعد آپ کے اور قریش کے درمیان گفت گو شروع ہوئی۔ یہاں تک کہ آپ نے قریش کی شرائط پر وہ معاہدہ کر لیا جس کو معاہدۂ حدیبیہ کہا جاتا ہے۔ جس کے مطابق یہ طے پایا تھا کہ دس سال تک دونوں فریقوں کے درمیان کوئی جنگ نہیں ہوگی۔

یہ ایک معلوم تاریخی واقعہ ہے کہ قدیم عرب صلۂ رحمی کو بے حد اہمیت دیتے تھے۔ ان کی قبائلی روایت کے مطابق، یہ بالکل ناممکن تھا کہ وہ آپ کے سامنے ایسی تجویز پیش کریں جو صلۂ رحمی کے اصول کے خلاف ہو اور قطعِ رحم پر مبنی ہو۔ اس اعتبار سے گویا کہ آپ نے یہ فرمایا کہ میں قریش کے سامنے سادہ کاغذ پیش کرتا ہوں۔ وہ جو چاہیں اس پر لکھ دیں۔ میں اس کو مان لوں گا۔

رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کی اس کھلی پیش کش کا سبب یہ تھا کہ آپ یہ جانتے تھے کہ قریش خواہ بظاہر کیسی ہی شرائط کاغذ پر لکھوائیں لیکن جنگ بندی کے بعد یہ واقعہ لازمی طور پر پیش آئے گا کہ دعوت کے امکانات کھل جائیں گے۔ اور دعوت کے امکانات کا کھلنا فتح اعظم کے امکانات کا کھلنا تھا، جیسا کہ عملاً دو سال کے اندر پیش آیا۔ دعوت انسانوں کی تسخیر ہے۔ اور جب انسان مسخر ہو جائیں تو اس کے بعد ہر چیز مسخر ہو جاتی ہے۔ اس کے بعد کوئی چیز مسخر ہونے کے لیے باقی نہیں رہتی۔

تنقید و تحقیق

تبع تابعین کے زمانہ میں جب حدیث رسول کا چرچا بڑھا تو عالم حدیث ہونا بڑائی کا سب سے اچھا معیار بن گیا۔ بہت سے لوگ فرضی حدیثیں گھڑ کر بیان کرنے لگے تاکہ لوگوں کے درمیان مرتبہ حاصل کریں یا حدیث کے زور پر اپنی بات کو اسلامی ثابت کریں۔ اس وقت اہل علم نے شدت کے ساتھ لوگوں کو متوجہ کیا کہ وہ دین کی بات اخذ کرنے میں سخت احتیاط برتیں۔ مثلاً محمد بن سیرین نے کہا کہ حدیث کا علم دین ہے، اس لیے تم دیکھ بھال کر علم دین حاصل کرو (ھذا العلم دین فانظروا عمن تاخذون دینکم) امام الاوزاعی نے کہا کہ تم اپنا دین صرف اس سے لو جس پر پورا اعتماد کر سکو۔ (خذ دینک عمن تثق بہ وترضی)

حدیث بیان کرنے والوں کے بارہ میں علمار حدیث نے سخت چھان بین کا طریقہ اختیار کیا۔ حسن بن صالح کہتے ہیں کہ جب ہم کسی شخص سے حدیث لینا چاہتے تو اس کے بارہ میں اتنا زیادہ پوچھ گچھ کرتے کہ لوگ کہنے لگتے کہ کیا تم اس سے رشتہ کرنا چاہتے ہو (کنا اذا اردنا ان نکتب عن الرجل سألنا عنہ حتی یقال لنا: اتریدون ان تزوجوہ) اشخاص کے کردار کی اس جانچ کی زد ان لوگوں پر پڑتی تھی جو جھوٹی روایتیں بنا کر لوگوں میں پھیلا رہے تھے۔ چنانچہ انھوں نے عوام کے درمیان یہ مشہور کیا کہ یہ محدثین غیبت کا ارتکاب کر رہے ہیں۔ حالاں کہ کسی کی غیبت کرنا گناہ ہے۔ اس لیے حضرت الحسن تابعی کو کہنا پڑا کہ اہل بدعت کی خرابیوں کو بتانا غیبت نہیں ہے (لیس لاھل البدعۃ غیبۃ)

قال ابوزید الانصاری النحوی۔ اتینا شعبۃ یوم مطر فقال۔ لیس ھذا یوم حدیث۔ الیوم یوم غیبۃ۔ تعالوا حتی نغتاب الکذابین (الکفایۃ)	ابوزید انصاری کہتے ہیں کہ ہم بارش کے دن شعبہ کے پاس آئے۔ انھوں نے کہا کہ آج حدیث کا دن نہیں ہے۔ آج غیبت کا دن ہے۔ آؤ ہم جھوٹ بولنے والوں کی غیبت کریں۔

جو شخص دین کے نام پر کوئی بات کہے، اس کی سخت جانچ کی جائے گی۔ اس کے اوپر تنقید عین جائز ہوگی۔ یہ اصول اس بات کی ضمانت ہے کہ کوئی شخص دین میں کوئی غلط بات شامل نہ کر سکے۔

زندگی، موت

انسان اپنی فطرت کے اعتبار سے مجبور ہے کہ وہ کسی کو عظمت کا مقام دے۔ یہ انسانی نفسیات کا تقاضا ہے۔ اب جو شخص اللہ کو عظیم سمجھے وہ موحد ہے، اور جو آدمی کسی اور چیز کو عظیم سمجھ لے وہ مشرک۔

قرآن میں سابق اہلِ کتاب کے بارہ میں کہا گیا ہے کہ انھوں نے بعد کے زمانہ میں اپنے احبار اور اپنے رہبان کو اپنا رب بنالیا (التوبہ ۳۱) یہ ایک مثال کی صورت میں بتایا گیا ہے کہ دورِ زوال میں قوموں اور امتوں کا حال کیا ہوتا ہے۔ وہ توحید پرستی کے مقام سے گر کر اکابر پرستی کی بیماری میں مبتلا ہو جاتی ہیں۔

قوم جب زندہ ہو تو وہ اقدار (values) کی پرستار ہوتی ہے۔ اور جب وہ مُردہ ہو جائے تو اس کے قومی اکابر اس کی پرستاری کا مرکز بن جاتے ہیں۔ یہی ایک لفظ میں، زندہ اور مردہ قوم کا خلاصہ ہے۔

زندہ قوم مقاصد کو اہمیت دیتی ہے اور مردہ قوم رجال کو۔ زندہ قوم حال میں جیتی ہے اور مردہ قوم گزرے ہوئے ماضی میں۔ زندہ قوم تنقید کا استقبال کرتی ہے اور مردہ قوم تنقید پر بپھر اٹھتی ہے۔ زندہ قوم حقیقی اشو پر کھڑی ہوتی ہے اور مردہ قوم فرضی اشو پر۔ زندہ قوم کو ہر ایک اپنا دوست نظر آتا ہے اور مردہ قوم کو ہر ایک اپنا دشمن۔ زندہ قوم اپنا مستقبل آپ بناتی ہے اور مردہ قوم دوسروں کے خلاف شکایت اور احتجاج میں مشغول رہتی ہے۔ زندہ قوم کی صفت تحمل اور برداشت ہے اور مردہ قوم کی صفت عدم تحمل اور عدم برداشت۔

جب کسی قوم کے افراد میں وہ علامتیں ظاہر ہو جائیں جو مردہ قوم کی علامت ہوا کرتی ہیں تو اس وقت ضرورت ہوتی ہے کہ ساری طاقت تربیت اور تیاری کے محاذ پر لگائی جائے۔ افراد میں از سرِ نو زندگی کی اسپرٹ پیدا کرنا ہی اس وقت کرنے کا اصل کام بن جاتا ہے۔

دورِ عروج کا قومی پروگرام پیش قدمی ہوتا ہے اور دورِ زوال کا قومی پروگرام تیاری۔ دورِ عروج میں آگے بڑھنے کا نام عمل ہوتا ہے اور دورِ زوال میں پیچھے ہٹنے کا نام عمل۔ دورِ عروج میں قوم اپنے اختتام میں ہوتی ہے اور دورِ زوال میں وہ دوبارہ اپنے آغاز میں پہنچ جاتی ہے۔

یہ فرق کیوں

پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وسلم نے قدیم مکہ میں لوگوں کو حق کا پیغام دینا شروع کیا تو لوگوں کی طرف سے نہایت سخت ردعمل ظاہر کیا گیا۔ اس وقت آپ کو یک طرفہ طور پر صبر واعراض کا حکم دیا گیا۔ چنانچہ مکہ کے ۱۳ سال تک آپ نے مکمل طور پر اس خدائی ہدایت پر عمل فرمایا۔ آپ ہر قسم کی قولی اور عملی تکلیفوں کو برداشت کرتے ہوئے انھیں اپنی پیغمبرانہ دعوت پہنچاتے رہے۔

دوسری طرف خود پیغمبر اسلام کے حالات بتاتے ہیں کہ آپ نے ان اسلاف پر سخت تنقیدیں کیں جن کو عرب کے لوگ اپنا مقتدا اور اپنا مذہبی رہنما سمجھتے تھے۔ مشرکین مکہ اس پر بہت بگڑتے تھے۔ ان کے سردار جب آپ کے چچا ابو طالب کے پاس جمع ہوئے تو ان سرداروں نے ان سے آپ کی جو شکایت کی وہ یہ تھی :

فقالوا یا اباطالِب، اِنّ ابن اخِیك	انھوں نے کہا کہ اے ابو طالب، آپ کے بھتیجے نے ہمارے
قدْ سبَّ آلِهتنا وَعابَ دِینَنا	معبودوں کو گالی دی اور ہمارے دین کو عیب لگایا
وَسَفَّه أحْلامنا وَضلَّلَ آباءنا	اور ہماری عقلوں کو بیوقوف بتایا اور ہمارے قومی
(سیرۃ ابن ہشام ۱/۲۷۷)	اکابر کو گمراہ ٹھہرایا۔

سیرت رسول کا یہ واقعہ بتاتا ہے کہ دو باتیں ایک دوسرے سے بالکل الگ ہیں۔ ایک ہے مدعو کی زیادتی اور اشتعال انگیزی کا معاملہ۔ اس معاملہ میں داعی کو صبر اور اعراض کا حکم دیا گیا ہے۔ داعی کو یک طرفہ طور پر مدعو کی زیادتیوں پر صبر کرنا ہے۔ داعی کے لیے کسی حال میں جائز نہیں کہ وہ مدعو کے مقابلہ میں ردعمل کا انداز اختیار کرے۔

دوسرا معاملہ ان اکابر قوم کا ہے جو مدعو گروہ کے مقتدا اور رہنما بنے ہوئے ہوں۔ جن سے عام لوگ فکری رہنمائی حاصل کرتے ہوں۔ اس دوسرے معاملہ میں داعی کو صبر کے بجائے احتساب کا طریقہ اختیار کرنا ہے۔ اس کو ان فکری رہنماؤں کی رہنمائی پر واضح تنقید کرنا ہے تاکہ حق کا حق ہونا اور باطل کا باطل ہونا پوری طرح واضح ہو جائے۔ داعی کو یہ تنقیدی کام بہر حال کرنا ہے خواہ مدعو کو وہ اتنا زیادہ برا معلوم ہو کہ وہ داعی کے بارے میں یہ کہنے لگے کہ تم ہمارے اکابر کو گالی دیتے ہو، تم ہمارے بڑوں کا سب وشتم کر رہے ہو۔

جھوٹی مخالفت

قدیم مکہ میں رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کے دشمن آپ کے خلاف جو باتیں مشہور کرتے تھے، ان میں سے ایک بات یہ تھی کہ قرآن خدا کا کلام نہیں، وہ ایک بناوٹی کلام ہے۔ قرآن میں بتایا گیا ہے کہ انکار کرنے والے لوگ کہتے ہیں کہ یہ صرف ایک جھوٹ ہے جس کو انھوں نے گھڑ لیا ہے، اور کچھ دوسرے لوگوں نے اس میں ان کی مدد کی ہے۔ پس یہ لوگ ظلم اور جھوٹ کے مرتکب ہوئے (الفرقان ۴)

دوسری جگہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ ہم کو معلوم ہے کہ وہ لوگ کہتے ہیں کہ (محمد کو یہ کلام) ایک آدمی سکھا ہے۔ جس شخص کی طرف وہ منسوب کرتے ہیں اس کی زبان عجمی ہے اور یہ قرآن صاف عربی زبان میں ہے (النحل ۱۰۳)

روایات سے معلوم ہوتا ہے کہ مکہ میں کچھ افراد تھے جو یہودیوں کی زبان جانتے تھے، مثلاً ابو فکیہہ، عداس جبر۔ وہ تورات وغیرہ پڑھتے تھے۔ چونکہ رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم اپنی تبلیغی سرگرمیوں کے تحت ان سے بھی ملتے تھے، اس کو مخالفین نے شوشہ بنا لیا:

ان النبی صلی اللہ علیہ وسلم ربما جلس الیہم لیعلمھم مما علمہ اللہ۔۔۔۔ فقال الکفار انما یتعلم محمد منہ (تفسیر القرطبی ۱۰/ ۱۷۸)

رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کبھی کبھی ان لوگوں کے پاس بیٹھتے تھے تاکہ ان کو اس بات کی تعلیم دیں جس کی تعلیم اللہ نے آپ کو دی ہے۔ پس کافروں نے کہا کہ محمد انھیں لوگوں سے سیکھتے ہیں۔

مذکورہ افراد مکہ کے معمولی افراد تھے۔ ان میں سے کوئی غلام تھا اور کوئی لوہار تھا۔ مگر رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کے مخالفین چوں کہ آپ کی شخصیت کو اور آپ کے کلام کو بالکل بے وزن سمجھتے تھے، اس لیے انھوں نے آپ کو انھیں معمولی لوگوں سے منسوب کر دیا کہ یہی افراد ہیں جو آپ کا ذریعہ معلومات ہیں۔

مزید یہ کہ انھوں نے سکھانے کے معاملہ کو سیکھنے کا معاملہ بنا دیا۔ رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم ان کے پاس اس لیے بیٹھتے تھے کہ ان کو تعلیم دیں۔ مگر بات کو بدل کر انھوں نے یہ کہہ دیا کہ آپ خود ان سے تعلیم حاصل کرتے ہیں۔

مخالفت کس طرح آدمی کو اندھا اور بہرا بنا دیتی ہے۔ جب آدمی کسی کے خلاف عناد میں مبتلا ہو جائے تو کھلی حقیقتیں بھی اس کو نظر نہیں آتیں۔ وہ سیدھی بات کو ٹیڑھے معنی پہنا دیتا ہے۔

اجنبی دین

امام مسلم بن الحجاج نے اپنی "صحیح" میں کتاب الایمان کے تحت ایک باب ان الفاظ میں قائم کیا ہے: بابُ بیانِ ان الاسلام بدأ غریبًا وسیعود غریبًا وانّہ یأرِزُ بین المسجدین۔ اس باب کے ذیل میں انھوں نے تین روایتیں نقل کی ہیں۔ ایک روایت یہ ہے:

عن ابی ھریرۃ قال قال رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم بدأ الاسلام غریبًا وسیعود کما بدأ غریبًا۔ فطوبیٰ للغرباء۔

ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ کہتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔ اسلام اجنبی کی حیثیت سے شروع ہوا اور پھر اسی اجنبی حالت کی طرف لوٹ جائے گا جیسا کہ شروع ہوا تھا۔ پس خیر و سعادت ہے اجنبیوں کے لیے۔

اسلام ساتویں صدی کے عرب میں بنو اسماعیل کے درمیان آیا۔ بنو اسماعیل اصلاً ملتِ ابراہیمی سے تعلق رکھتے تھے۔ مگر ان کے اور حضرت ابراہیم کے درمیان ڈھائی ہزار سال کا فاصلہ تھا۔ لمبی مدت کے نتیجہ میں ان کے اندر دینی بگاڑ آچکا تھا، وہ دینِ ابراہیم کے نام سے صرف دینِ آباء کو جانتے تھے۔ اس بنا پر ابتداءً ان کے لیے پیغمبر اسلام کے پیغام کو سمجھنا مشکل بنا رہا۔

حدیث کے مطابق، خود ملتِ مسلمہ کی یہی حالت اس وقت ہو جائے گی جب کہ وہ زوال کا شکار ہو جائے۔ جب کہ وہ اسلام کی اسپرٹ کو کھو دے اور ایک خود ساختہ اسلام اس کے درمیان باقی رہے۔

امت پر جب یہ وقت آتا ہے تو وہ دین کے نام سے صرف دینِ اکابر کو جانتی ہے اور دینِ خدا اس کے لیے اجنبی چیز ہو جاتا ہے۔ قومی خواہشوں سے مطابقت کرنے والا دین اس کو دین نظر آتا ہے اور اصولوں پر مبنی دین اس کے لیے ناقابلِ فہم چیز بن جاتا ہے۔ ظواہر دین کی دھوم مچانے کو ایسے لوگ کام سمجھتے ہیں اور حقیقتِ دین کی بات انھیں اپنے لیے نامانوس دکھائی دیتی ہے۔ ایسے ماحول میں جو لوگ قرنِ اوّل والا دین اختیار کریں وہ دوبارہ لوگوں کو اجنبی دکھائی دینے لگتے ہیں۔

دو قسم کے رہنما

جی۔کے چسٹرٹن (G.K. Chesterton) ایک انگریز رائٹر تھا۔ وہ ۱۸۷۴ میں لندن میں پیدا ہوا۔ ۱۹۳۶ میں اس کی وفات ہوئی۔ اس کا قول ہے کہ ایک بڑا آدمی وہ ہے جو ہر آدمی کو یہ احساس دلائے کہ تم مجھ سے چھوٹے ہو۔ مگر حقیقی معنوں میں بڑا آدمی وہ ہے جو ہر آدمی کے اندر بڑائی کا احساس پیدا کر دے :

There is a great man who makes every man feel small. But the real great man is the man who makes every man feel great.

لیڈر دو قسم کے ہوتے ہیں۔ ایک وہ جو بڑے بڑے اشو لے کر اٹھتے ہیں۔ جن کے پاس بڑے بڑے نعرے ہوتے ہیں۔ جو ہمیشہ ہائی پروفائل میں بات کرتے ہیں۔ ایسے لوگ ہر جگہ چھپتے ہیں۔ ہر طرف ان کا تذکرہ کیا جاتا ہے۔ ہر مقام پر ان کو استقبال ملتا ہے۔ اس طرح ان کی شخصیت نمایاں ہو جاتی ہے۔ وہ ہر آدمی کو اپنے سے بڑے دکھائی دینے لگتے ہیں۔ یہ وہ لیڈر ہیں جن کی اپنی شخصیتیں تو خوب نمایاں ہو جاتی ہیں مگر عوام کو ان سے کوئی حقیقی فائدہ نہیں ملتا۔

دوسرا لیڈر وہ ہے جو حقیقی معنوں میں عام انسان کو فائدہ پہنچانا چاہتا ہے۔ وہ ہر آدمی کا درد اپنے سینہ میں لیے ہوئے ہوتا ہے۔ اس کا یہ مزاج اس کو ایسے کام کی طرف لے جاتا ہے جو ایک عام انسان کے لیے تو یقیناً بے حد مفید ہوتا ہے مگر وہ کہنے میں کوئی بڑا کام نظر نہیں آتا۔ وہ اخبار کے صفحہ اول کی سرخی نہیں بنتا۔ اس کی بنیاد پر اس کو تعریفی قصیدے نہیں ملتے۔

ایسے لیڈر کا عمل اس کو ذاتی شہرت تو نہیں دیتا۔ البتہ قوم کے ہر فرد کو وہ اونچا کر دیتا ہے۔ وہ ہر آدمی کو اپنے دائرہ میں ہیرو بناتا ہے۔ وہ ہر آدمی کی شخصیت کو بلند کر دیتا ہے۔

عظمت پرست لوگ اگرچہ پہلی قسم کے لیڈروں ہی کی پوجا کرتے ہیں۔ مگر انسانیت کے حقیقی خیر خواہ صرف دوسری قسم کے لیڈر ہیں۔ وہ اپنے کو چھوٹا کر کے دوسروں کو بڑا بنا دیتے ہیں۔ وہ اپنے کو بنیاد میں دفن کر کے دوسروں کو اونچے مینار کی مانند کھڑا کر دیتے ہیں۔ وہ اپنی نفی کر کے دوسروں کے لیے اثبات کے مواقع فراہم کر دیتے ہیں۔

دعوتی عمل

موجودہ زمانہ میں مسلمانوں کے اندر جتنی بھی اصلاحی تحریکیں اٹھیں، ان سب نے اپنی کوششوں کا مرکز صرف مسلمانوں کو بنایا۔ یہ ایک بنیادی غلطی تھی جس کی بنا پر غیر معمولی کوششوں کے باوجود ان کا کوئی نتیجہ برآمد نہ ہو سکا۔ کیوں کہ موجودہ مسلمان اپنے زوال کے نتیجہ میں ٹھہرے ہوئے پانی کی طرح بن چکے تھے۔

ٹھہرے ہوئے پانی میں کثافت آجاتی ہے۔ جب کہ رواں پانی ہمیشہ اپنی تازگی کو باقی رکھتا ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ ٹھہرے ہوئے پانی میں نیا پانی شامل ہونا بند ہو جاتا ہے۔ یہی حال موجودہ زمانہ کے مسلمانوں کا ہے۔ وہ اب ٹھہرے ہوئے پانی کی مانند ہو چکے ہیں۔ اس لیے اب صرف مسلمانوں کے اندر اصلاحی کام کرنے سے ان کے اندر حقیقی زندگی نہیں آسکتی۔ اس کے لیے نئے خون (New blood) کی ضرورت ہے۔ اس کے لیے ضرورت ہے کہ ان کے پرانے پانی میں نئے پانی کا چشمہ شامل کیا جائے۔

مسلمانوں کے ٹھہرے ہوئے پانی کو رواں پانی بنانے کا طریقہ صرف ایک ہے۔ اور وہ دعوت ہے۔ دعوت کے ذریعہ دوسری قوموں کے لوگ آکر مسلمانوں کے دھارے میں ملتے ہیں۔ اس طرح پرانے پانی میں نیا پانی شامل ہو کر اس کو تازہ اور پر کیفیت بنا دیتا ہے۔

یہ اہم فائدہ دعوت کے ذریعہ حاصل ہوتا ہے۔ مسلمان دعوت کا کام چھوڑ کر ٹھہرے ہوئے پانی کی طرح ہو جاتے ہیں۔ اور دعوت کے کام میں مشغول ہو کر اپنے پانی کو رواں پانی بنا لیتے ہیں۔ دعوت کا کام خدائی فریضہ کی ادائیگی ہے اور اسی کے ساتھ مسلمانوں کو زندہ گروہ کی حیثیت سے قائم رکھنے کی ضمانت بھی۔

کچھ لوگوں کا خیال ہے کہ پہلے مسلمانوں کی اصلاح کرنا ضروری ہے۔ مسلمانوں کی اصلاح کے بعد ہی بیرونی دعوت کا کام کیا جا سکتا ہے۔ مگر نقل اور عقل دونوں اعتبار سے یہ ایک بے بنیاد نظریہ ہے (ملاحظہ ہو الرسالہ نومبر ۱۹۸۹، صفحہ ۲۷)

مزید یہ کہ موجودہ حالات میں یہ بالکل ناممکن ہے۔ مسلمان اس وقت اپنے زوال کے دور میں ہیں۔ اس لیے خود ان کی اصلاح کے لیے بھی صرف داخلی کوشش کافی نہیں ہو سکتی۔ مسلمانوں کے پرانے خون میں جب تک نیا خون بڑی مقدار میں شامل نہ کیا جائے ان کے اندر کوئی گہری تبدیلی لانا ممکن نہیں جو لوگ اس راز کو نہ جانیں وہ انسانی زندگی کی الف ب بھی نہیں جانتے۔

ربانی انسان

اسلامی تحریک کا مقصد حکومتوں کو توڑنا یا کسی قسم کا "نظام" قائم کرنا نہیں ہے۔ اسلامی تحریک کا مقصد انسان بنانا ہے۔ اسلامی تحریک کی ساری کوشش یہ ہوتی ہے کہ ایک انسان کو ربانی انسان بنادے۔ جب اس قسم کے انسان کسی سماج میں بڑی تعداد میں تیار ہوجائیں، تو ان کے مجموعی ارادہ سے جو چیز ظہور میں آتی ہے اسی کا نام اسلامی نظام ہے۔

اسلام کا نشانہ فرد ہے۔ اسلام ایسے انسان پیدا کرنا چاہتا ہے جو خدا کو ایک زندہ اور حاضر ناظر ہستی کی حیثیت سے پالیں۔ وہ دنیا میں خدا کی کاریگری کو دیکھ کر حیران رہ جائیں۔ وہ اس کے انتہا انصاف کو سوچ کر اس کے شکر کے جذبہ سے نہا اٹھیں۔ وہ اس کی قوت و عظمت کو محسوس کرکے دہل جائیں۔ وہ اس کی پکڑ کے احساس سے ڈھ پڑیں۔

خدا کی موجودگی کا احساس ان کے اوپر اتنا زیادہ طاری ہو کہ ان کو اس سے حیا آنے لگے۔ کوئی برا کام کرتے ہوئے ان کو ایسا لگے جیسے خدا کی نگاہیں اس کو برچھی کی طرح چھید رہی ہیں۔ کسی کے اوپر ظلم کرتے ہوئے انھیں دکھائی دے کہ خدا کے فرشتے خدا کی جہنم کو لیے ہوئے کھڑے ہیں اور اس کی تمام ہولناکیوں کے ساتھ اس کو ان کے اوپر انڈیل دینا چاہتے ہیں۔

ایمان کے متعلق بتایا گیا ہے کہ وہ خوف اور امید کے درمیان ہوتا ہے۔ مومن ایک طرف خدا کے خوف سے کانپتا ہے۔ اسی ساتھ وہ اس کی رحمت کا امیدوار بھی رہتا ہے۔ حتی کہ اہل ایمان کے دل میں خدا کی جنت کا شوق اتنا بڑھتا ہے کہ وہ خدا کی جنت کے تصور سے رقص کرنے لگتے ہیں۔ اپنی کوتاہیوں کا احساس اگر ان کے اندر خشیت کی تھرتھری پیدا کرتا ہے تو اسی کے ساتھ اللہ کی رحمت اور صمدیت کا احساس ان کو جنت کے لہلہاتے ہوئے باغوں کا مشاہدہ اسی دنیا میں کرادیتا ہے۔

حکومتوں سے ٹکرانا اور سیاسی انقلاب کے نعرے لگانا کوئی کام نہیں۔ اصل کام یہ ہے کہ ایسے انسان پیدا کیے جائیں جو خدا کی زمین پر خدا کے خوف اور خدا کی محبت سے سرشار ہوکر چلنے لگیں۔ ایسے انسان ہی دنیا میں انسانیت کی بہار لاتے ہیں اور جہاں ایسے انسان نہ ہوں، وہاں خزاں کے سوا کوئی اور چیز وجود میں آنے والی نہیں۔

سبب اپنے اندر

قرآن میں جس طرح ذکر و عبادت کے احکام ہیں، اسی طرح قرآن میں اجتماعی امور کی بابت بھی کھلے بیانات موجود ہیں۔ اس اعتبار سے جب ہم موجودہ معاملہ میں قرآن کی رہنمائی معلوم کرنا چاہتے ہیں تو قرآن نہایت واضح طور پر یہ بتاتا ہوا نظر آتا ہے کہ اس دنیا میں جو افتاد بھی کسی کے ساتھ پیش آتی ہے وہ حقیقۃً ایک کے اوپر دوسرے کی زیادتی نہیں ہوتی، بلکہ وہ کمزور فریق کی کمزوری کی سزا ہوتی ہے جو طاقت ور فریق کی طرف سے اسے بھگتنی پڑتی ہے۔ آخرت میں ہر ایک کا جو حساب ہوگا، وہ ایک الگ معاملہ ہے۔ مگر دنیا کے اعتبار سے جو صورتِ حال ہے وہ یہی ہے۔

قرآن (البقرہ ۳۰) میں واضح طور پر اعلان کیا گیا ہے کہ جو مصیبت بھی تمہارے اوپر پڑتی ہے وہ خود تمہارے اپنے کیے کا نتیجہ ہوتی ہے (وما اصابکم من مصیبۃ فبما کسبت ایدیکم / الشوریٰ)

ایک مرفوع حدیث کے مطابق، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے علی بن ابی طالب رضی اللہ عنہ سے فرمایا کہ اے علی، جو بھی بیماری یا سزا یا مصیبت تم کو پہنچتی ہے وہ خود تمہارے اپنے ہاتھوں کی کمائی ہوتی ہے (یا علی، ما اصابکم من مرض او عقوبۃ او بلاء فی الدنیا فبما کسبت ایدیکم) الجامع لاحکام القرآن ۲۰/۱۶

قرآن میں اس اصول کا انطباق سب سے پہلے خود صحابۂ کرام کی جماعت پر کیا جا چکا ہے یہ انطباق بعد کے مسلمانوں کے لیے نہایت سبق آموز ہے۔

ایک مثال غزوۂ احد (۳ ھ) کی ہے۔ یہ جنگ یک طرفہ طور پر مخالفین اسلام کی سازش اور ان کی جارحیت کے نتیجہ میں پیش آئی تھی۔ اس جنگ میں ابتداءً مسلمان کامیاب ہو گئے۔ مگر آخر میں ان کو شکست ہوئی۔ قرآن میں اس پر تبصرہ کیا گیا تو مخالفین اسلام کی کھلی زیادتیوں کے باوجود ہارنے کی ذمہ داری خود مسلمانوں کے اوپر ڈال دی گئی۔ کہا گیا کہ اس جنگ میں شکست کا سبب یہ تھا کہ تم نے کمزوری دکھائی، تم نے معاملہ میں نزاع کیا اور تم نے رسول کی ہدایت کی خلاف ورزی کی (حتی اذا فشلتم وتنازعتم فی الامر وعصیتم من بعد ما اراکم ما تحبون) آل عمران ۱۵۲

دوسری مثال غزوۂ حنین (۸ھ) کی ہے۔ اس جنگ میں بھی تمام تر زیادتی مخالفین اسلام کی تھی۔ انھوں نے غدّارانہ طور پر مسلمانوں کی جماعت پر حملہ کر دیا تھا۔ اس جنگ میں ابتداءً مسلمانوں کو شکست ہوگئی۔ وہ میدانِ جنگ سے بھاگنے لگے۔ تاہم بعد کو وہ پھر سنبھلے اور دوبارہ جنگ کی۔ دوبارہ جنگ میں اللہ تعالیٰ نے انھیں کامیابی عطا فرمائی۔

اس جنگ میں مخالفین نے مسلمانوں کو کافی نقصان پہنچایا تھا۔ اس پر قرآن میں تبصرہ کیا گیا۔ اس تبصرہ میں بھی، مخالفین کی کھلی ہوئی زیادتی کے باوجود خود مسلمانوں کو تنبیہہ کی گئی۔ فرمایا کہ حنین میں ابتداءً جو شکست اور نقصان پیش آیا اس کی وجہ تمہاری یہ کمزوری تھی کہ تم کو اپنی کثرتِ تعداد پر ناز ہوگیا (ویوم حنین اذ اعجبتکم کثرتکم فلم تغن عنکم شیئا) التوبہ ۲۵

قرآن و حدیث کے ان بیانات کے مطابق، صحیح طریقہ یہ ہے کہ جب ایک فریق دوسرے فریق کی زیادتی کا شکار ہو تو زیادتی کا شکار ہونے والا فریق شکایت اور احتجاج میں اپنا وقت ضائع نہ کرے۔ اس کے برعکس اس کو چاہیے کہ وہ اپنا ذاتی احتساب کرنا شروع کر دے۔

وہ دوسروں کے ظلم کا اعلان کرنے کے بجائے اپنی کوتاہیوں کو تلاش کرے۔ وہ دوسروں سے مطالبہ کرنے کے بجائے خود اپنی حالت کی اصلاح کی طرف توجہ دے۔ کیوں کہ جو کچھ پیش آیا ہے، اس کا سبب خود اس کے اپنے اندر ہے نہ کہ اس کے باہر۔

جس مسئلہ کا سبب آدمی کے اپنے اندر ہو، اس کے بارہ میں دوسروں کے خلاف شور و غل کرنا محض اپنا وقت ضائع کرنا ہے۔ ایسی کوششوں سے اس کو کچھ ملنے والا نہیں۔ اس کے معاملہ کی اصلاح صرف اپنی کمیوں کو دور کرنے سے ہو سکتی ہے، اور پہلی فرصت میں اس کو اسی اصل کام میں لگ جانا چاہیے۔

ٹالرنس : فطرت کا اصول

ٹالرنس (رواداری، برداشت) فطرت کا ایک عالمی اصول ہے۔ شیر اور ہاتھی دونوں انتہائی بڑے جانور ہیں۔ دونوں ایک دوسرے کے حریف کی حیثیت رکھتے ہیں۔ پھر بھی دونوں ایک ساتھ جنگل میں رہتے ہیں۔ یہ صرف ٹالرنس کے ذریعہ ممکن ہوتا ہے۔ چنانچہ جنگلوں میں دیکھا گیا ہے کہ ایک طرف سے ہاتھی آرہا ہو اور دوسری طرف سے شیر چل رہا ہو تو دونوں ایک دوسرے سے الجھے بغیر خاموشی کے ساتھ اپنے اپنے راستہ پر گزر جاتے ہیں۔ اگر دونوں اس طرح ایک دوسرے کے ساتھ ٹالرنس کا معاملہ نہ کریں تو دونوں آپس میں لڑنے لگیں، یہاں تک کہ دونوں لڑلڑ کر تباہ ہو جائیں۔

شیر اور ہاتھی کو یہ طریقہ فطرت نے سکھایا ہے۔ اسی طرح انسان کے جسم میں فطرت نے ٹالرنس کا نظام قائم کر رکھا ہے۔ میڈیکل سائنس میں اس کو حیاتیاتی ٹالرنس (biological tolerance) کہا جاتا ہے۔ اس سے مراد ایک جسم حیوانی کی یہ صلاحیت ہے کہ وہ ایک چیز سے بُرا اثر لیے بغیر اس سے ربط کو یا جسم میں اس چیز کے داخل کیے جانے کو برداشت کرے :

In biology, the ability of an organism to endure contact with a substance, or its introduction into the body, without ill effects. (X/31)

جسم کی اسی صلاحیت پر امراض کے علاج کا پورا نظام قائم ہے۔ بیماری کے وقت جسم کے اندر ایسی دوائیں ڈالی جاتی ہیں جو مجموعی حیثیت سے جسم کے لیے مضر ہیں۔ مگر جسم خارجی چیزوں کے معاملہ میں اپنی ساری حساسیت کے باوجود، ایسی دواؤں کو برداشت کرتا ہے۔ وہ ان کے ساتھ ٹالرنس کا معاملہ کرتا ہے۔ اسی "حیاتیاتی ٹالرنس" کی بنا پر یہ ممکن ہوتا ہے کہ یہ دوائیں جسم میں داخل ہو کر اپنا اثر دکھائیں۔ وہ جسم کے دوسرے اعضاء پر بُرا اثر ڈالے بغیر اس کے بیمار عضو پر عمل کر کے اس کو اچھا کر سکیں۔

ٹالرنس کا یہی طریقہ انسانی سماج میں بھی مطلوب ہے۔ جنگل کے جانور جو کچھ اپنی جبلّت (instinct) کے تحت کرتے ہیں اور انسانی جسم جو کچھ اپنی فطرت کے تحت کرتا ہے وہی عمل انسان کو اپنے شعور کے تحت کرنا ہے۔ اس کو اپنے سوچے سمجھے فیصلہ کے تحت ٹالرنس کا طریقہ

اختیار کر کے دوسروں کے ساتھ زندگی گزارنا ہے۔

جب بھی زیادہ لوگ ساتھ مل کر زندگی گزاریں گے تو ان کے درمیان شکایت اور اختلاف کے واقعات بھی ضرور پیدا ہوں گے۔ ایسا ایک گھر کے اندر ہوگا۔ سماج کے اندر ہوگا، پورے ملک میں ہوگا، اور اسی طرح بین اقوامی زندگی میں بھی ہوگا۔ انسان خواہ جس سطح پر بھی ایک دوسرے سے ملیں اور تعلقات قائم کریں، ان کے درمیان ناخوش گوار واقعات کا پیش آنا بالکل لازمی ہے۔

ایسی حالت میں کیا کیا جائے، ٹالرنس اسی سوال کا جواب ہے۔ ایسی حالت میں ایک شخص دوسرے شخص کے ساتھ اور ایک گروہ دوسرے گروہ کے ساتھ رواداری اور برداشت کا معاملہ کرے۔ مل جل کر زندگی گزارنے اور مل جل کر ترقی کرنے کی یہی واحد قابل عمل صورت ہے۔ اس اسپرٹ کے بغیر انسانی تمدن کی تعمیر اور اس کی ترقی ممکن نہیں۔

ٹالرنس کوئی انفعالی رویہ نہیں، وہ عین حقیقت پسندی ہے۔ اس کا مطلب یہ نہیں کہ آدمی کے لیے زیادہ بہتر چوائس (choice) لینے کا موقع تھا اور اس نے پست ہمتی کی بنا پر ایک کمتر چوائس کو اختیار کر لیا۔ حقیقت یہ ہے کہ موجودہ دنیا میں اس کے سوا کوئی اور چوائس ہمارے لیے ممکن ہی نہیں۔ ٹالرنس ہماری ایک عملی ضرورت ہے نہ کہ کسی قسم کی اخلاقی کمزوری۔

اکثر ایسا ہوتا ہے کہ آدمی ایک صورت حال کو اپنے لیے ناخوش گوار پاکر اس سے لڑنے لگتا ہے اور بالآخر تباہی سے دوچار ہوتا ہے۔ ایسا کیوں ہوتا ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ آدمی نے اپنی کوتاہ نظری کی بنا پر یہ سمجھا کہ اس کے لیے انتخاب خوش گوار اور ناخوش گوار کے درمیان ہے۔ وہ ناخوش گوار سے لڑ گیا تاکہ خوش گوار کو حاصل کر سکے۔

حالانکہ نتیجہ نے بتایا کہ اس کے لیے انتخاب خوش گوار اور ناخوش گوار کے درمیان نہیں تھا بلکہ اس کے لیے انتخاب ناخوش گوار اور تباہی کے درمیان تھا۔ حقیقت یہ ہے کہ اس دنیا میں بہت کم ایسا ہوتا ہے کہ آدمی کے لیے انتخاب خوش گوار اور ناخوش گوار کے درمیان ہو۔ زیادہ تر ایسا ہوتا ہے کہ اس کے لیے انتخاب کم ناخوش گوار اور زیادہ ناخوش گوار میں ہوتا ہے۔ ایسی حالت میں عقل مندی یہی ہے کہ آدمی زیادہ ناخوش گوار سے بچنے کے لیے کم ناخوش گوار پر راضی ہو جائے۔

بیشتر انسان اسی غلط فہمی کا شکار ہو کر اپنے کو برباد کرتے رہتے ہیں۔ وہ ایک اقدام کرتے ہیں اور سمجھتے ہیں کہ ان کا اقدام ناپسندیدہ صورت حال کو ہٹا کر پسندیدہ صورت حال کو لانے کے لیے ہے۔ مگر جب موجودہ صورت حال ختم ہو جاتی ہے تو ان کو معلوم ہوتا ہے کہ نئی صورت حال میں وہی ناخوش گواری زیادہ بڑی مقدار میں موجود ہے جس کی کم مقدار کو برداشت نہ کرنے کی وجہ سے انھوں نے اپنا اقدام کیا تھا۔

ٹالرنس اسی حکمت کا نام ہے۔ اس دنیا میں برداشت کرنا آدمی کو زندگی کی طرف لے جاتا ہے اور بے برداشت ہو جانا صرف موت کی طرف۔

ٹالرنس کا طریقہ ہم کو فرصت عمل دیتا ہے۔ اس کی وجہ سے یہ ممکن ہوتا ہے کہ ہم ناموافق حالات سے ایڈجسٹ کر کے اپنے لیے وہ موقع حاصل کر لیں جب کہ ہم اپنی زندگی کا سفر معتدل طور پر جاری رکھ سکیں۔ اس کے برعکس اگر ہم ٹالرنس کو چھوڑ دیں اور جو چیز بھی ہم کو ناموافق نظر آئے اس سے لڑنے لگیں تو اس کا نتیجہ صرف یہ ہوگا کہ ہم ایک چیز کو "برائی" کے نام سے ختم کریں گے، صرف اس لیے کہ اس کے بعد ایک اور شدید تر برائی میں اپنے آپ کو مبتلا کر لیں۔

شیر اور ہاتھی اگر ایک دوسرے کو گوارا نہ کریں تو دونوں اپنی موت کو دعوت دیں گے۔ مگر جب وہ ایک دوسرے کو گوارا کرتے ہیں تو دونوں اپنے لیے زندگی کا موقع پا لیتے ہیں۔ یہ ٹالرنس کا سب سے بڑا فائدہ ہے۔ ٹالرنس آپ کو فرصت عمل دیتا ہے۔ وہ آپ کو کرنے کا موقع فراہم کرتا ہے۔ اور اس دنیا میں بلاشبہ سب سے بڑی چیز فرصت عمل ہے۔ فرصت عمل سے محرومی ہی کا نام بربادی ہے۔ اور فرصتِ عمل کو پا کر اس کو استعمال کرنے ہی کا نام کامیابی۔

تنظیم

سوامی وشنو دیوانند اہندستان کے مشہور گرو ہیں۔ وہ اپنا مشن ڈیوائن لائف سوسائٹی (Divine Life Society) کے نام سے چلاتے ہیں۔ دنیا کے تقریباً ہر بڑے شہر میں ان کا سنٹر قائم ہے۔ وہ اکثر اپنے ذاتی ہوائی جہاز سے سفر کرتے ہیں۔ اسی لیے ان کو اڑن سوامی (flying Swami) کہا جاتا ہے۔ ان کے اعلان کے مطابق، ان کا مقصد دنیا کو امن اور محبت کا پیغام دینا ہے (ٹائمس آف انڈیا ۱۸ جون ۹۲ ۱۹)

ساری دنیا میں ان کے شاگردوں (disciples) کی تعداد ۵۰ ہزار سے زیادہ ہے جن میں بہت سے ممتاز افراد بھی شامل ہیں، مثلاً جارج ہیریسن (George Harrison) اور پیٹر سیلرس (Peter Sellars) اور روی شنکر، وغیرہ۔ ان کی غیر معمولی کامیابی کا راز کیا ہے، ان کے ایک تعلیم یافتہ شاگرد نے کہا کہ سوامی کی دنیوی کامیابی اس لیے ہے کہ وہ نہایت عمدہ ناظم ہیں :

The Swami's worldly success is because he is a very good organiser. (p. 14)

یہ ایک حقیقت ہے کہ کامیابی کا بہت زیادہ تعلق نظم یا تنظیم سے ہے۔ خاص طور پر کوئی بڑا کام کبھی تنظیم کے بغیر انجام نہیں دیا جا سکتا۔ تنظیم نہیں تو بڑا کام بھی نہیں۔

تنظیم کیا ہے، تنظیم یہ ہے کہ ہر کام مقرر اصول کے مطابق کیا جائے۔ کام سے تعلق رکھنے والے تمام لوگوں پر یہ واضح ہو کہ ان کے حقوق کیا ہیں اور ان کے فرائض کیا۔ ہر آدمی جس کو کوئی کام سونپا جائے وہ پوری طرح قانون اور ضابطہ کے تحت سونپا جائے۔ جو فیصلہ کیا جائے وہ نہ صرف سب کے علم میں ہو بلکہ اس کی معقولیت کو بھی لوگ جانتے ہوں۔ تمام وابستہ افراد یہ محسوس کریں کہ وہ کام میں شریک ہیں اور وہ اس کے ایک ناگزیر جزء کی حیثیت رکھتے ہیں۔ ہر آدمی اپنے آپ کو نظام کا پابند سمجھتا ہو۔

نظم دراصل ناظم کا بدل ہے۔ جب ناظم موجود نہ ہو تو لوگوں کو احساس ہونا چاہیے کہ وہ بالواسطہ طور پر مقرر نظم کی صورت میں وہاں موجود ہے۔

کامیاب تنظیم کی بہترین آئیڈیل مثال شہد کی مکھی کا چھتہ ہے۔ جو شخص کامیاب تنظیم قائم کرنا چاہتا ہو اس کو شہد کی مکھی کے چھتہ کا مطالعہ کرنا چاہیے۔ شہد کی مکھی انسان کو صرف شہد فراہم نہیں کرتی۔ وہ شہد کا ایک اعلیٰ کارخانہ قائم کر کے انسان کو یہ سبق بھی دیتی ہے کہ اجتماعی منصوبوں کی تنظیم کس طرح کی جانی چاہیے۔

موجودہ زمانہ میں مینجمنٹ ایک مستقل سبجکٹ ہے۔ اس کو ایک مستقل سائنس کے طور پر پڑھایا جاتا ہے۔ ساری دنیا میں مینجمنٹ کی تعلیم اور اس کی تحقیق کے لیے نہایت بڑے بڑے ادارے قائم ہیں۔

سادہ طور پر کہا جاسکتا ہے کہ کامیاب تنظیم کے لیے ضروری ہے کہ فرد اور اجتماعی ادارہ، شاخ اور مرکز، نیچے کے لوگ اور اوپر کے لوگ، سب کے درمیان برابر تال میل ہو۔ بلا انقطاع ان کے درمیان ربط جاری رہے۔ ہر ایک جال کی مانند دوسرے افراد سے جڑا رہے۔

مزید یہ کہ ہر سطح پر نگرانی اور احتساب کا نظام قائم ہو۔ بہتر کارکردگی پر کارکنوں کا اعتراف کیا جائے اور ناقص یا غلط کارکردگی پر فوراً متعلقہ شخص کی گرفت کی جائے۔

تنظیم اجتماعی کام کی انجینیرنگ ہے۔ جتنی اچھی تنظیم اتنا ہی اچھا اجتماعی ادارہ۔

ضروری اطلاع

جنوری ۱۹۹۲ کا الرسالہ اُردو خصوصی نمبر کے طور پر شائع ہوگا۔ اس کا عنوان "عہدِ حاضر میں علماء کا رول" ہوگا۔ اس کی ضخامت زیادہ ہوگی۔ اس لیے اس ایک شمارہ کی قیمت فی شمارہ چھ روپے ہوگی۔

منیجر الرسالہ

اصل مسئلہ

فریڈرک اعظم (۱۷۱۲ - ۱۷۸۶) روس کا بادشاہ تھا۔ اس کو ملک میں وصول ہونے والے ٹیکس کی مقدار کم نظر آئی۔ اس نے ٹیکس کی شرح بڑھا دی۔ تاکہ اس کے خزانہ میں زیادہ مقدار میں رقم جمع ہو سکے مگر اس کے بعد وصول شدہ ٹیکس کی جو رقم خزانہ میں آئی وہ پچھلے سالوں سے کچھ زیادہ نہ تھی۔ بادشاہ نے اپنے درباریوں سے کہا کہ کیا بات ہے، ٹیکس کی شرح میں اضافہ کے باوجود ٹیکس کی رقم میں کوئی خاطر اضافہ نہیں ہوا۔

دربار میں ایک پرانا فوجی جنرل تھا۔ اس نے بادشاہ کے سوال کا جواب عملی صورت میں دیا۔ اس نے برف کا ایک ٹکڑا ہاتھ میں لے کر اس کو اوپر بلند کیا۔ اور لوگوں سے کہا کہ اس کو دیکھ لیجئے کہ یہ کتنا بڑا ہے۔ اس کے بعد اس نے برف کو اپنے قریب کے آدمی کو دیا اور اس سے کہا کہ اس کو دست بدست بادشاہ تک پہونچاؤ۔ اب ایک نے دوسرے کو اور دوسرے نے تیسرے کو دیتے ہوئے برف کو آگے بڑھایا۔ یہاں تک وہ بادشاہ تک پہونچ گیا۔ برف جب بادشاہ تک پہونچا تو وہ پگھلتے پگھلتے مونگ پھلی کے دانہ کے برابر ہو چکا تھا۔

اس مثال سے مذکورہ جنرل نے بادشاہ کو یہ سبق دیا کہ سرکاری مالیہ میں کمی کی وجہ عمال کی بدعنوانی ہے نہ کہ ٹیکس کی شرح میں کمی۔ اگر عمال کے اندر بدعنوانی کو ختم نہ کیا جائے تو وصول شدہ رقم کا بڑا حصہ ان کی جیب میں جاتا رہے گا اور حکومت کے حصہ میں آنے والی رقم بدستور وہی کی وہی رہے گی۔

یہی صورت حال آج ہندستان کی ہے، ہمارے یہاں ہر سال ٹیکسوں میں اضافہ کیا جا رہا ہے۔ مگر حکومت کو ملنے والی رقم میں مطلوبہ اضافہ نہیں ہوتا۔ کیوں کہ حد درجہ بڑھے ہوئے کرپشن کی وجہ سے ٹیکس کی پوری رقم حکومت کے خزانہ میں نہیں پہونچتی۔ وہ افسروں کی جیب میں چلی جاتی ہے۔ اس کا نتیجہ یہ ہے کہ واشنگٹن پوسٹ کی رپورٹ کے مطابق ہندستان اس وقت دنیا کا چوتھا سب سے زیادہ مقروض ملک ہے۔ ہندستان پر اس وقت جو غیر ملکی قرضہ ہے، اس کی مقدار ترسٹھ ارب ڈالر ہے۔

ہندستان کے اقتصادی مسئلہ کا حل کرپشن کو گھٹانا ہے نہ کہ ٹیکس کو بڑھانا۔

اصل مسئلہ

فریڈرک اعظم (۱۷۱۲ - ۱۷۸۶) روس کا بادشاہ تھا۔ اس کو ملک میں وصول ہونے والے ٹیکس کی مقدار کم نظر آئی۔ اس نے ٹیکس کی شرح بڑھا دی۔ تاکہ اس کے خزانہ میں زیادہ مقدار میں رقم جمع ہو سکے مگر اس کے بعد وصول شدہ ٹیکس کی جو رقم خزانہ میں آئی وہ پچھلے سالوں سے کچھ زیادہ نہ تھی۔ بادشاہ نے اپنے درباریوں سے کہا کہ کیا بات ہے، ٹیکس کی شرح میں اضافہ کے باوجود ٹیکس کی رقم میں کوئی خاص اضافہ نہیں ہوا۔

دربار میں ایک پرانا فوجی جنرل تھا۔ اس نے بادشاہ کے سوال کا جواب عملی صورت میں دیا۔ اس نے برف کا ایک ٹکڑا ہاتھ میں لے کر اس کو اوپر بلند کیا۔ اور لوگوں سے کہا کہ اس کو دیکھ لیجئے کہ یہ کتنا بڑا ہے۔ اس کے بعد اس نے برف کو اپنے قریب کے آدمی کو دیا اور اس سے کہا کہ اس کو دست بدست بادشاہ تک پہونچاؤ۔ اب ایک نے دوسرے کو اور دوسرے نے تیسرے کو دیتے ہوئے برف کو آگے بڑھایا۔ یہاں تک وہ بادشاہ تک پہونچ گیا۔ برف جب بادشاہ تک پہونچا تو وہ پگھلتے پگھلتے مونگ پھلی کے دانہ کے برابر ہو چکا تھا۔

اس مثال سے مذکورہ جنرل نے بادشاہ کو یہ سبق دیا کہ سرکاری مالیہ میں کمی کی وجہ عمال کی بدعنوانی ہے نہ کہ ٹیکس کی شرح میں کمی۔ اگر عمال کے اندر بدعنوانی کو ختم نہ کیا جائے تو وصول شدہ رقم کا بڑا حصہ ان کی جیب میں جاتا رہے گا اور حکومت کے حصہ میں آنے والی رقم بدستور وہی کی وہی رہے گی۔

یہی صورت حال آج ہندستان کی ہے، ہمارے یہاں ہر سال ٹیکسوں میں اضافہ کیا جا رہا ہے مگر حکومت کو ملنے والی رقم میں مطلوبہ اضافہ نہیں ہوتا۔ کیوں کہ حد درجہ بڑھے ہوئے کرپشن کی وجہ سے ٹیکس کی پوری رقم حکومت کے خزانہ میں نہیں پہونچتی۔ وہ افسروں کی جیب میں چلی جاتی ہے۔ اس کا نتیجہ یہ ہے کہ واشنگٹن پوسٹ کی رپورٹ کے مطابق ہندستان اس وقت دنیا کا چوتھا سب سے زیادہ مقروض ملک ہے۔ ہندستان پر اس وقت جو غیر ملکی قرضہ ہے، اس کی مقدار ترسٹھ ارب ڈالر ہے۔

ہندستان کے اقتصادی مسئلہ کا حل کرپشن کو گھٹانا ہے نہ کہ ٹیکس کو بڑھانا۔

ایک سفر

طرابلس (لیبیا) میں ۲۴ — ۲۸ ستمبر ۱۹۹۰ کو ایک انٹرنیشنل اسلامی کانفرنس ہوئی۔ اس کانفرنس کی دعوت کے مطابق ایک سفر ہوا۔ سفر کے کچھ تاثرات یہاں درج کئے جاتے ہیں۔

۲۲ ستمبر کو صبح ساڑھے تین بجے گھر سے روانگی ہوئی۔ فجر کی نماز دہلی ایئرپورٹ پر پڑھی۔ ایئرپورٹ پر ایک صاحب سے ملاقات ہوئی۔ وہ اخوانی مزاج کے تھے۔ اسلامی جہاد پر بات کرتے ہوئے میں نے کہا کہ اسلامی جہاد (یعنی قتال) صرف دفاعی ہے۔ اسلام کا اصل اقدام دعوت ہے نہ کہ قتال۔

انھوں نے کہا کہ ہم بھی یہی کہتے ہیں۔ البتہ ہمارا کہنا ہے کہ دعوت کی راہ میں جب رکاوٹ ڈالی جائے تو رکاوٹ کو ختم کرنے کے لئے قتال کیا جائے گا۔ میں نے کہا کہ "دعوت کی راہ میں رکاوٹ" کا نظریہ دراصل موجودہ زمانہ کے سیاست پسند مفکرین کا پیدا کردہ ہے۔ ان لوگوں کے نزدیک اسلامی دعوت کا مقصد اسلامی حکومت قائم کرنا ہے۔ یہ لوگ جب اسلام کو ایک سیاسی نظام کی حیثیت سے نافذ کرنا چاہتے ہیں تو انھیں محسوس ہوتا ہے کہ وقت کے حکمراں اس انقلابی مقصد کی راہ میں رکاوٹ ہیں۔ چنانچہ وہ ان سے لڑنے کے لئے کھڑے ہو جاتے ہیں تاکہ رکاوٹ کو دور کرکے اسلامی قانون کی حکومت قائم کریں۔

میں نے کہا کہ اسلامی دعوت کا یہ تصور ہی سرے سے غلط ہے۔ اسلامی دعوت دراصل توحید کا اعلان اور آخرت کا انذار ہے۔ اور اعلان توحید اور انذار آخرت کے کام میں، کم از کم موجودہ زمانہ میں کسی رکاوٹ کا سوال ہی نہیں۔ ہندستان میں بائیں چلو (خذ ذات الیسار) کا اصول ہے اور عرب ملکوں میں دائیں چلو (خذ ذات الیمین) کا۔ اب اگر کوئی شخص یہ کہے کہ "دائیں چلو" کا اصول اسلام کا اصول ہے۔ اس لئے میں ہندستان کی سڑکوں پر دائیں چلوں گا تو ایسے شخص کو ہندستان کا نظام ایک رکاوٹ معلوم ہوگا۔ وہ کہے گا کہ ہمیں چاہیے کہ لڑ کر اس رکاوٹ کو دور کریں۔ مگر ظاہر ہے کہ یہ ایک احمقانہ بات ہے۔

بورڈنگ کارڈ لینے کے لئے ایئرلائن کی کھڑکی پر کھڑا ہوا تو میں لائن میں سب سے پیچھے تھا۔

اچانک اندر سے ایک عرب نوجوان باہر آیا۔ اس نے میرا ٹکٹ لیا اور اندر جا کر ضروری کارروائی کی اور بورڈنگ پاس لا کر مجھے دے دیا۔ اسی کے ساتھ اس نے ایک خوب صورت چھپا ہوا کارڈ مزید دیا جو ضیافت کے لئے تھا۔ اس پر لکھا ہوا تھا:

Royal Jordanian is pleased to invite you to avail the facility of Baurya Lounge in Departure Hall; Thank You.

اس تجربہ کے بعد دل بھر آیا۔ میں نے کہا کہ کاش قیامت کے دن بھی ایسا ہی ہو کہ میں عجز و دل فگاری کی تصویر بنا ہوا سب سے پیچھے کھڑا ہوں اور اللہ تعالیٰ فرشتہ کو بھیج دیں کہ میرے اس عاجز بندے کے پاس جاؤ اور اس کے داخلۂ رحمت کا کارڈ خود اس کے پاس پہنچا دو۔

دہلی ایئر پورٹ کے اندر میں امیگریشن (Immigration) کی کھڑکی پر کھڑا تھا۔ میرے قریب کی دوسری کھڑکی پر شور سنائی دیا۔ میں نے دیکھا کہ کھڑکی پر بیٹھے ہوئے پولیس کے آدمی سے دو مسافروں کا جھگڑا ہو رہا تھا۔ دوسری طرف میری کھڑکی پر بھی ایک وردی پوش آدمی تھا۔ مگر وہ نہایت شریفانہ انداز میں مسافروں کا کام انجام دے رہا تھا۔ میں نے اس کا نام پوچھا تو اس نے کہا: سرب جیت سنگھ۔

میں نے سوچا کہ جو لوگ آدمیوں کو فرقوں اور گروہوں کی صورت میں دیکھتے ہیں وہ کتنی بڑی غلطی کرتے ہیں۔ مثال کے طور پر ہمارے سطحی قائدین ہر فساد کے موقع پر آنکھ بند کر کے "پولیس" کی مذمت کرنا شروع کر دیتے ہیں۔ گویا کہ ہر وہ شخص جس نے پولیس کی وردی پہن لی، وہ ایک ظالم گروہ کا فرد بن گیا۔ رائے قائم کرنے کا یہ طریقہ حد درجہ ظالمانہ ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ ایک انسان اور دوسرے انسان میں فرق ہوتا ہے۔ انسانوں کو ان کے کردار کے اعتبار سے بانٹنا چاہئے نہ کہ فرقوں اور گروہوں کے اعتبار سے۔

دہلی سے اردن ایئر ویز کی فلائٹ نمبر ۱۹۳ کے ذریعہ روانگی ہوئی۔ راستہ میں ایئر لائنز کا انگریزی میگزین رائل ونگ (Royal Wings) پڑھا۔ حسب معمول اس میں ہوٹلوں کے شاندار باتصویر اشتہارات تھے۔ عنوان تھا:

The Finest collection of Hotels in the Middle East.

سرسبز و شاداب ماحول میں خوب صورت اور شاندار عمارتیں دیکھنے میں بہت پرکشش

معلوم ہوئیں۔ میں نے سوچا کہ میں بار بار اسی قسم کے ہوٹلوں میں ٹھہرا ہوں۔ مگر جب وہاں ٹھہرتا ہوں تو وہاں کا قیام اور وہاں کی زندگی میں میرے لئے کوئی کشش نہیں ہوتی۔

خیال آیا کہ ان تصویروں کے پرکشش ہونے کا سبب یہ ہے کہ ان میں ہوٹلوں کا ایک پہلو حذف ہو گیا ہے۔ وہ ان کا تعب اور حزن ہے۔ قرآن میں اہل جنت کی زبان سے کہلایا گیا ہے کہ اس اللہ کا شکر ہے جس نے ہم سے حزن کو ختم کر دیا (اذھب عنا الحزن) دنیا کا یہ تجربہ آخرت کے معاملہ کا ایک تعارف ہے۔ دنیا میں حزن تصویر میں حذف ہو جاتا ہے مگر حقیقت میں وہ موجود رہتا ہے۔ آخرت میں خدا اپنے کمال قدرت سے خود حقیقت کے اندر سے حزن کو حذف کر دے گا۔ اس کے بعد خدا کی دنیا ابدی خوشیوں کی لازوال آرام گاہ بن جائے گی۔

۲۲ ستمبر کو دوپہر بعد کا وقت تھا۔ باہر سورج کی روشنی پوری طرح فضا میں پھیلی ہوئی تھی۔ ہمارا جہاز اردن کے صحرائی حصہ کے اوپر ۵۳۵ میل فی گھنٹہ کی رفتار سے اڑ رہا تھا۔ کھڑکی سے باہر کی طرف نظر ڈالی تو نیچے خالص صحرائی منظر تھا۔ دور دور تک کہیں کوئی آبادی دکھائی نہیں دیتی تھی۔ ہر طرف غیر آباد ریتیلے میدانوں کا منظر تھا۔

اس وقت میرے ہاتھ میں اردن ایئر لائنز کا عربی مجلہ "الاجنحہ" تھا۔ اس کے ایک مضمون کا عنوان تھا: المیاہ فی الوطن العربی و الاردن اس میں عرب دنیا کے آبشار (الشلالات) دکھائے گئے تھے۔ آرٹ پیپر پر چھپی ہوئی رنگین تصویروں میں نظر آ رہا تھا کہ پہاڑوں کے اوپر سے پانی کے بڑے بڑے دھارے آبشار بن کر نیچے گر رہے ہیں۔ میں نے سوچا کہ خدا کی قدرت بھی کیسی عجیب ہے۔ زمین پر ایک طرف خشک صحراؤں میں ریت اڑ رہی ہے اور دوسری طرف اسی زمین میں پانی کے دریا بہہ رہے ہیں۔

اس بار لیبیا کا سفر ہنگامی حالات میں ہوا۔ ۲ اگست ۱۹۹۰ کو کویت کے خلاف عراق کے فوجی اقدام نے یہ صورت حال پیدا کر دی ہے کہ ہر طرف جنگ کی باتیں ہو رہی ہیں۔ مجھے خیال آیا کہ "لیبیا" کا لفظ جدید دور کی جنگی طاقت کو بھی بتاتا ہے اور اس کی کمزوری کو بھی۔

امریکی جنرل آجکل صدام حسین کو بم کا نشانہ بنانے کی بات کر رہے ہیں (ہندستان ٹائمس ۷ ستمبر ۱۹۹۰) ۱۹۸۶ میں اسی طرح امریکی بمباروں نے لیبی حکمراں کو نشانہ بنایا تھا۔ یہ واقعہ ایک طرف

بتاتا ہے کہ موجودہ زمانہ میں کس طرح یہ ممکن ہوگیا ہے کہ ایک فوجی افسر فضائی راستہ سے دشمن کے ملک میں داخل ہو جائے۔ اور وہاں اپنے مطلوبہ نشانہ پر بم گرا کر محفوظ طور پر واپس چلا آئے۔ اسی کے ساتھ یہی واقعہ انسان کی محدودیت کو بھی بتا رہا ہے۔ یعنی ساری مشینی ترقیوں کے باوجود اب بھی انسان کے لئے یہ ممکن نہیں کہ وہ نتیجہ کو صد فی صد اپنے حق میں یقینی بنا سکے۔

ٹائم (۱۰ ستمبر ۱۹۹۰) نے اسی بات کو ان لفظوں میں کہا تھا کہ امریکہ کے فوجی جنرل صدام حسین کے خلاف جراحی ضرب کی بات کر رہے ہیں لیکن جراحی ضرب عام طور پر غلط نشانوں پر مارتی ہے، جیسا کہ ۱۹۸۶ میں لیبیا کے خلاف حملہ میں ہوا۔ اس حملہ کا نشانہ معمر قذافی تھے۔ مگر عملاً جو ہوا وہ یہ کہ فرانسیسی سفارت خانہ تباہ ہوگیا اور قذافی کی لڑکی مر گئی:

Generals like to talk of "surgical strikes", but surgical strikes usually hit the wrong targets - like the misguided air raid on Libya in 1986 that wrecked the French embassy and killed Colonel Gaddafi's daughter (p. 56).

دہلی سے روانہ ہو کر ہمارا جہاز پاکستان، افغانستان، ایران اور عراق کے اوپر سے اڑتا ہوا دوپہر بعد عمان کے ایرپورٹ پر اتر گیا۔ اس سے پہلے میں عمان سے دو بار گزر چکا ہوں، مگر اس بار عمان ایرپورٹ پر کچھ بھیڑ کا سا منظر دکھائی دیا۔ حالانکہ اس سے پہلے یہاں بہت کم آدمی نظر آتے تھے۔ خلیج کے موجودہ حالات غالباً اس کا سبب ہیں۔

عمان کا لفظ آجکل خبروں میں بہت زیادہ آیا ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ ۲ اگست کو کویت پر عراق کے حملہ کے بعد جب لوگ بھاگنا شروع ہوئے تو ان کے لئے اردن کی سرحد سب سے زیادہ کھلی ہوئی تھی۔ چنانچہ بہت بڑی تعداد میں لوگ بھاگ بھاگ کر اردن پہنچ گئے۔

حملہ کے وقت تقریباً ۸۰ ہزار ہندستانی کویت میں تھے۔ ان کی بڑی تعداد بھاگ کر اردن میں داخل ہوگئی۔ یہاں سے انھیں بسوں کے ذریعہ عمان لایا گیا۔ تازہ اطلاع کے مطابق، بوقت تحریر تقریباً دس ہزار ہندستانی عمان میں رہ گئے ہیں۔ بقیہ کو عمان سے بمبئی پہنچا دیا گیا ہے۔ یہ لوگ عمان سے ۱۱۰ کیلو میٹر کے فاصلہ پر ازرق ریفیوجی کیمپ میں ٹھہرے ہوئے تھے۔

اس مقصد کے لئے ایر انڈیا اور اقوام متحدہ کے جہاز مشترکہ طور پر مصروف رہے۔ ابتداً روزانہ

دجہاز عمان سے بمبئی جاتے تھے۔ پھر روزانہ ۱۲ جہاز جانے لگے۔ اب ان کی تعداد روزانہ نو کر دی
ئی ہے۔ چند دن کے اندر انشاء اللہ تمام ہندستانی اپنے وطن پہنچائے جاچکے ہوں گے۔

عمان سے طرابلس کے لئے اردن ایر لائنز کی فلائٹ نمبر ۴۵ کے ذریعہ روانگی ہوئی۔ راستہ
ں آج (۲۲ ستمبر) اردن کے دو اخباروں کا مطالعہ کیا۔ ایک عربی روزنامہ "الرای" دوسرا انگریزی
وزنامہ (Jordan Times) انگریزی اخبار کے پہلے صفحہ کی پہلی سرخی یہ تھی کہ سعودی عرب نے اردن
دتیل کی سپلائی بند کر دی:

S. Arabia cuts off oil supply to Jordan

ایسا ہونا بالکل فطری ہے۔ کیوں کہ اردن نے کھلم کھلا کویت۔عراق کے معاملہ میں صدام حسین کا
ساتھ دیا ہے۔ عربی اخبار کے صفحہ ۱۸ پر چھ چوکھٹوں میں مختلف کمپنیوں اور اداروں کے اعلانات تھے۔
ن اعلانات میں اردن کے ملک حسین کے ساتھ صدام حسین کی تصویر چھپی ہوئی تھی۔ ہر چوکھٹے پر تائید و
ولاء (تائید اور دوستی)، جیسے الفاظ لکھے ہوئے تھے۔ ان میں صدام حسین کو قائد عربی کے روپ میں
ھایا گیا اور "عہد" کیا گیا تھا کہ ظالم امریکیوں اور صلیبیوں کے خلاف جنگ میں ہم آپ کے ساتھ ہیں۔

اخبار میں کویت کے خلاف صدام حسین کی جارحیت کا مطلق کوئی ذکر نہ تھا۔ مختلف انداز میں
رف امریکہ اور اس کے ساتھیوں کے ظلم اور فریب کو نمایاں کیا گیا تھا۔ ایک عراقی فوجی طارق نعیم کا
ط (رسالہ) اپنے مصری فوجی دوست دسوقی ابو المعاطی کے نام نمایاں طور پر چھاپا گیا تھا۔ اس
ط میں عراقی فوجی نے مصری فوجی کو شرم دلائی تھی کہ کیا تم ظالموں کی فوج میں شامل ہو کر میرے اوپر
ولی مارنا چاہتے ہو۔ حالاں کہ یہ سب ڈاکو ہیں جو سمندر پار سے عربوں کو قتل کرنے کے لئے آئے
یں۔ خط کا خاتمہ اس جذباتی لفظ پر ہوا تھا: فهل تدعهم يفعلون (پھر کیا تم انھیں
چھوڑ دوگے کہ وہ جو چاہتے ہیں کریں)

اردن کے اخبار میں اس قسم کی خبروں اور اس قسم کے مضمون کو پڑھ کر میں نے سوچا کہ انسان
ی کیسا عجیب ہے۔ وہ دوسرے کے ظلم کو بتاتا ہے اور اپنے ظلم کو چھپاتا ہے۔ صدام حسین نے
اضح طور پر کویت کے خلاف جارحیت کی ہے۔ مگر اس کی کھلی ہوئی جارحیت کا کوئی ذکر نہیں، سارا
ور و غوغا صرف اس بات پر ہے کہ امریکہ اپنی فوجوں کو لے کر خلیج عرب میں کیوں آگیا۔

یہ ایک بدترین دھاندلی ہے۔ ساری دنیا کے لوگ اسی دھاندلی میں مبتلا ہیں۔ ہندستان کے مسلمانوں میں تمام لکھنے اور بولنے والے اسی دھاندلی کا شکار ہیں۔ یہ ایسا جرم ہے جس کے ہوتے ہوئے مسلمانوں کو ہرگز خدا کی مدد ملنے والی نہیں۔

ٹائم میگزین کے سائز پر پیرس سے ایک عربی ہفت روزہ "الوطن العربی" کے نام سے نکلتا ہے۔ جہاز کے اندر اس کا شمارہ ۷ ستمبر ۱۹۹۰ موجود تھا۔ اس کا بھی مطالعہ کیا۔ مگر یہ ایک سرسری قسم کا پرچہ تھا۔ اس کی کور اسٹوری تھی: خلیج کا بحران، جنگ یا جنگ نہیں (ازمة الخليج حرب ام لا حرب) مضمون میں دونوں پہلوؤں کو واضح کرتے ہوئے بتایا گیا تھا کہ جنگ ہونے کا امکان بھی اتنا ہی ہے جتنا جنگ نہ ہونے کا۔

میں اگرچہ فرسٹ کلاس میں سفر کر رہا تھا۔ اور فرسٹ کلاس کے مسافروں کو جہاز میں غیر معمولی سہولتیں دی جاتی ہیں۔ مگر میں اپنی وسیع اور آرام دہ سیٹ پر اس طرح بے قرار تھا جیسے مجھے کسی عذاب خانہ میں ڈال دیا گیا ہے۔ میرا یہی حال ہر سفر میں ہوتا ہے۔ میں نے سوچا کہ دوسرے لوگ سفر سے لطف اٹھاتے ہیں۔ آخر میرا مزاج ایسا کیوں ہے کہ دنیا کی کوئی راحت میرے لئے خوشی اور سکون کا باعث نہیں بنتی۔

نفسیاتی اعتبار سے اس پر غور کرتے ہوئے میری سمجھ میں آیا کہ اس کی وجہ غالباً یہ ہے کہ اپنے مزاج کے اعتبار سے میں ایک معیار پسند (Idealist) آدمی ہوں۔ دنیا کی کوئی چیز، خواہ وہ کتنی ہی اچھی ہو، وہ معیار (آئیڈیل) سے کم ہوتی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ میں کسی بھی چیز سے، خواہ بظاہر وہ کتنی ہی اچھی ہو، کبھی مطمئن نہیں ہو پاتا۔

میرے اس مزاج نے میرے لئے زندگی کو ایک مسلسل کرب بنا دیا ہے۔ تاہم اس مزاج کا ایک فائدہ مجھے یہ ملا کہ میں اس سطحیت سے بچ گیا جس میں بہت سے لوگ مبتلا ہوئے۔ انھوں نے اپنی کسی کتاب یا اپنے کسی عمل کو "شادم از زندگی خویش کہ کارے کردم" کا درجہ دیا اور کہا قیامت کے دن جب خدا پوچھے گا کہ کیا لائے تو میں اپنی اس کتاب یا اپنے اس عمل کا ہدیہ خدا کی خدمت میں پیش کر دوں گا۔

میری معیار پسندی میرے لئے اس میں مانع ہو گئی کہ میں اپنی کسی کتاب یا اپنے کسی عمل کو یہ د

ں کہ وہ خدائے ذو الجلال کی خدمت میں بطور ہدیہ پیش کرنے کے قابل ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ
یں اس قسم کے کسی تصور کو خدا کی تصغیر کے ہم معنی سمجھتا ہوں۔

۲۲ ستمبر کو مقامی وقت سے ڈھائی بجے دن میں جہاز طرابلس کے ہوائی اڈہ پر اتر گیا۔ پلوری
رواز نہایت ہموار تھی۔ اس کے کیپٹن (قائد الطائرہ) عبد اللہ المدبر تھے۔ عرب لوں میں اب ٹکنیکل
ہرین کافی تعداد میں پیدا ہو چکے ہیں۔

ایر پورٹ سے شہر آتے ہوئے سڑک پر ایک جگہ یہ کتبہ لکھا ہوا نظر آیا: الوحدۃ العربیۃ
ضرورۃ حتمیہ (عرب اتحاد ناگزیر ضرورت) اس کو پڑھتے ہوئے خیال آیا کہ پچھلے پچاس سال
سے اس قسم کے الفاظ ہر جگہ بولے اور لکھے جا رہے ہیں، مگر عین ان الفاظ کے ہجوم میں عرب
تحاد آج خلیج عرب میں غرق ہو چکا ہے۔

اس کی وجہ یہ ہے کہ کلام اتحاد کو واقعہ بننے کے لئے شعورِ اتحاد درکار ہے۔ اور شعور اتحاد ساری
سلم دنیا میں کہیں موجود نہیں۔ لوگ اتحادیوں کے ساتھ متحد ہونا جانتے ہیں۔ حالانکہ حقیقی اتحاد اس
قت قائم ہوتا ہے جب کہ لوگ اختلافیوں کے ساتھ متحد ہونے کو جان لیں۔

طرابلس میں میرا قیام فندق باب البحر (کمرہ ۸۳۷) میں تھا۔ ۲۳ ستمبر کی صبح کو ناشتہ کی
یز پر ایک صاحب سے ملاقات ہوئی۔ وہ کسی قدر مختلف لہجہ میں انگریزی بول رہے تھے۔ پوچھنے پر
علوم ہوا کہ وہ پہلے عیسائی "منسٹر" تھے۔ ۱۹۸۳ میں مسلمان ہو گئے۔ اپنی عمر انھوں نے ۶۶
سال بتائی۔ ان کا قدیم نام فسی ہوئی منو (Fisii Hoi Manu) تھا۔ موجودہ نام "فیاض" ہے:

Haji Faiyaz Manu, P.O. Box 1156
Nukualofa, Tonga Island, South Pacific Ocean

ں نے پوچھا کہ آپ نے کیسے اسلام قبول کیا۔ انھوں نے کہا کہ میری ملاقات فجی کے ایک مسلمان
محمد عثمان خاں) سے ہوئی۔ میں نے ان پر عیسائیت کی تبلیغ کرنی چاہی۔ اس طرح میرے اور ان
ے درمیان گفت گو شروع ہوئی۔ یہ بحث کئی دن تک جاری رہی۔ میرا کہنا تھا کہ یسوع مسیح خدا
(God) تھے۔ انھوں نے کہا کہ انجیل کے مطابق، حضرت مسیح نے آخر وقت میں ایلی ایلی (میرے
دا، میرے خدا) پکارا۔ اس سے ثابت ہوتا ہے کہ وہ اپنے سوا کسی اور کو خدا سمجھتے تھے۔

میں نے کہا کہ یسوع مسیح دنیا کے نجات دہندہ (Saviour of the World) تھے۔ انھوں نے کہ
کہ جو انسان، آپ کے بیان کے مطابق، خود اپنے آپ کو یہودیوں اور رومیوں سے نہ بچا سکا، وہ
ساری دنیا کو کس طرح بچائے گا۔ اس طرح بحثیں ہوتی رہیں۔ یہاں تک کہ مجھ پر اسلام کی صداقت
واضح ہوگئی اور میں نے اسلام قبول کر لیا۔

۲۴ ستمبر ۱۹۹۰ کی صبح کو اس عالمی کانفرنس کا افتتاح ہوا اور ۲۸ ستمبر تک جاری رہا۔ اس کا
شعار تھا ـــــ "الدعوۃ الاسلامیۃ و آفاق المستقبل" اس کانفرنس میں مختلف ملکوں کے
۴۵۰ سے زیادہ افراد شریک ہوئے۔ یہ سب ۳۰ تنظیموں کے نمائندہ تھے۔ صدر جلسہ نے
اپنی افتتاحی تقریر میں کہا کہ دنیا جو اس وقت مختلف بحرانوں سے گزر رہی ہے، وہ دراصل دین
اسلام کی محتاج ہے جو کہ فی الواقع سچا دین ہے (ان العالم الذی یمر بازمات الآن ھو
فی حاجۃ الی الاسلام لان الاسلام ھو الدین الحقیقی) تاہم بہت کم لوگوں نے اصل
موضوع پر اظہار خیال کیا۔ زیادہ تر لوگوں کی تقریروں کا رخ استعماری سازشوں اور صلیبی اور صیہونی
حملوں کی طرف رہا۔

کانفرنس کی کارروائیاں ذات العماد کے ہال میں ہوئیں جو انتہائی جدید طرز پر بنایا گیا ہے
مگر تقریریں زیادہ تر تقلیدی انداز کی تھیں۔ ایک مقرر اپنی پرجوش تقریر کر کے اسٹیج سے اترے
تو میں نے کہا کہ آپ لوگ "جدید طرز کے ہال میں قدیم طرز کی تقریر کر رہے ہیں"۔ تقریروں اور
مقالوں کی زبان عربی اور انگریزی تھی۔

موتمر میں بیش تر لوگوں نے جوش کے انداز میں تقریر کی۔ تاہم بعض لوگ نہایت سنجیدہ نظر
آئے۔ مثلاً یوگوسلاویہ کے دکتور احمد سلاوچ نے اپنی عربی تقریر میں کہا کہ موجودہ زمانہ میں کام کا
بہترین طریقہ پرامن طریقہ ہے۔ ہم کو علمی اسلوب میں اپنا کام کرنا چاہئے۔ ہم کو ٹکراؤ سے ہمیشہ پرہیز
کرنا چاہئے۔ حتی کہ اگر فریق ثانی ٹکراؤ شروع کرے تب بھی ہم کو ٹکراؤ سے بچ کر اپنا کام علمی اور دعوتی
اسلوب میں جاری رکھنا چاہئے۔ ان کی تقریر مجھے پسند آئی۔ مگر خواہش کے باوجود الگ سے میں ان
سے ملاقات نہ کر سکا۔

ایک صاحب کناڈا سے آئے تھے۔ انھوں نے اپنی انگریزی تقریر میں ایک بات کہی جو مجھے

بہت پسند آئی۔ انھوں نے مسلمانوں کو مشورہ دیتے ہوئے کہا کہ سب سے پہلے آپ کو دوسروں کی نظر میں اپنی اعتباریت قائم کرنا چاہئے۔ اس کے بعد ایسا ہوگا کہ آپ کی طرف سے جو بات آئے گی، وہ آسانی کے ساتھ قبول کر لی جائے گی:

First of all you have to establish your own credibility.
Then what comes from you will be easily accepted.

ایک عربی مقالہ کے بعد اس پر تبصرہ کرتے ہوئے میں نے جو کچھ کہا، اس کو یہاں نقل کیا جاتا ہے۔ اس مقالہ کا موضوع تھا: دنیا کی حالیہ تبدیلیاں اور عالم اسلام پر اس کا اثر (المتغیرات فی العالم وتاثیرھا علی العالم الاسلامی)

میں نے کہا کہ آج مسلمانوں کا ذہن غیر اہم باتوں میں الجھا ہوا ہے، اور جو اصل بات ہے اس کی طرف کوئی توجہ نہیں۔ میں نے کہا کہ جدید دنیا کے مطالعہ کے بعد میں نے یہ سمجھا ہے کہ آج پوری دنیا دو قسم کے تضادات میں مبتلا ہے۔ ایک علمی تضاد اور دوسرا دینی تضاد۔ اس تضاد سے آج انسان کو نکالنا، یہی موجودہ زمانہ میں دعوتی عمل کا اصل میدان ہے۔

میں نے کہا کہ جدید دنیا کا علمی تضاد وہ ہے جو مشہور سائنسداں شرڈنگر (Schrodinger) کے اس قول میں ظاہر ہوتا ہے۔ اس نے بہت سے سائنس دانوں کی نمائندگی کرتے ہوئے کہا کہ فطرت کے بارہ میں سب سے زیادہ ناقابل فہم بات یہ ہے کہ وہ قابل فہم ہے:

The most incomprehensible thing about
nature is that it is comprehensible.

جدید علماء ایک ناقابل حل مشکل میں مبتلا ہیں۔ وہ کائنات کو خدا کے بغیر سمجھنا چاہتے ہیں۔ مگر خدا کائنات میں اتنا زیادہ شامل ہے کہ خدا کو الگ کر کے کائنات کسی طرح سمجھ میں نہیں آتی۔ اس تضاد کا واحد حل یہ ہے کہ آج کے اہل علم کو خدا کے عقیدہ پر لایا جائے۔ خدا کے عقید کو مانتے ہی وہ اپنے اس لاینحل تضاد سے نجات حاصل کر لیں گے۔

دوسرا تضاد وہ ہے جس کو مذہبی تضاد کہا جا سکتا ہے۔ انڈیا کے ایک ہندو مفکر نے کہا ہے کہ ہندوؤں کا اصل مسئلہ یہ ہے کہ ان کا مذہب اتنا زیادہ غیر عقلی ہے کہ وہ ان کے لئے کھڑے ہونے کی مثبت

بنیاد نہیں بن سکتا۔ وہ صرف مسلم دشمنی کی منفی بنیاد پر کھڑے ہو سکتے ہیں۔ مگر منفی بنیاد کبھی کسی قوم کو ترقی کی طرف نہیں لے جا سکتی۔ یہ بتاتے ہوئے انھوں نے کہا کہ جو چیز پسندیدہ ہے وہ ممکن نہیں، اور جو ممکن ہے وہ پسندیدہ نہیں:

What is desirable is not possible
and what is possible is not desirable.

یہ صرف ہندوازم کی بات نہیں۔ یہی اسلام کے سوا تمام مذاہب کی بات ہے۔ یہ تمام مذاہب محرف مذاہب ہیں۔ وہ تحریف کے نتیجہ میں غیر عقلی بن چکے ہیں۔ اس کے نتیجہ میں موجودہ قومیں اس صورتحال سے دوچار ہیں کہ ان کا قومی مذہب قابل عمل نہیں ہے۔ اور اسلام قابل عمل ہے مگر قومی تعصب کی بنا پر وہ اس کو اختیار نہیں کرتے۔

یہ دو قسم کے تضاد ہیں جن میں آج کی تمام قومیں مبتلا ہیں۔ دنیا کو اس تضاد سے نکالنا، یہی آج دعوتی اعتبار سے کرنے کا سب سے بڑا کام ہے۔

۲۵ ستمبر کی شام کا وقت ہے۔ میں اپنے کمرہ کی پشت کی بالکنی پر کھڑا ہوں۔ سامنے حد نظر تک سمندر (میڈیٹیرینین) پھیلا ہوا ہے۔ سمندر میں کچھ تفریحی کشتیاں نظر آئیں جو اپنے مسافروں کے ساتھ سمندر میں تیز رفتاری کے ساتھ دوڑ رہی تھیں۔ فضا میں کچھ سمندری چڑیاں منڈلا رہی تھیں جو بار بار مچھلی پکڑنے کے لئے پانی میں گرتی تھیں۔ ساحل سے ملی ہوئی سڑک پر دوڑتی ہوئی کاروں کا منظر تھا جو اپنے مسافروں کو لئے ہوئے مسلسل چلی جا رہی تھیں۔

ان چیزوں کو دیکھ کر میری سمجھ میں آیا کہ ولقد کرمنا بنی آدم وحملناھم فی البر والبحر کا مطلب کیا ہے اور اس میں انسان کے لئے جس "تکریم" کا ذکر ہے، اس سے کیا مراد ہے وہ یہ کہ انسان کے ساتھ "حملنا" کا معاملہ کیا گیا ہے، جب کہ حیوانات کے ساتھ "حملنا" کا معاملہ نہیں کیا گیا۔

پاؤں والے جانور اپنے پیروں پر چلتے ہیں۔ مچھلیاں اپنی طاقت سے تیرتی ہیں۔ چڑیاں اپنے بازوؤں کے ذریعہ اڑتی ہیں، مگر انسان سواری پر بیٹھ کر اپنا راستہ طے کرتا ہے۔ خشکی میں اس کے لئے گاڑی ہے۔ سمندروں میں اس کے لئے کشتی ہے اور فضاؤں میں اس کے لئے ہوائی جہاز ہے۔ گویا

انسان کے لئے اللہ تعالیٰ نے شاہانہ معاملہ فرمایا ہے۔ جو لوگ اس عطیۂ الٰہی کا حقیقی احساس کر کے اس چیز کا ثبوت دے سکیں جس کو حمد اور شکر کہا گیا ہے، ایسے لوگوں کے ساتھ آخرت میں بھی شاہانہ معاملہ کیا جائے گا، جیسا کہ قرآن میں ارشاد ہوا ہے: وَإِذَا رَأَيْتَ ثَمَّ رَأَيْتَ نَعِيمًا وَمُلْكًا كَبِيرًا

یہاں جو لوگ جمع تھے، ان کی بہت بڑی تعداد چوں کہ مجھ کو جانتی تھی، اس لئے اکثر ان سے مختلف موضوعات پر گفتگو ہوتی رہتی تھی۔ تاہم جس موضوع پر سب سے زیادہ گفتگو ہوئی وہ یہ تھا کہ اسلام کے احیاء کے لئے موجودہ زمانہ میں ہمیں کیا کام کرنا ہے۔

جن لوگوں کو عالم اسلام کے تعلیم یافتہ لوگوں کا تجربہ ہے، وہ جانتے ہیں کہ موجودہ زمانہ کے تعلیم یافتہ مسلمانوں کی بیشتر تعداد "تغییرِ نظام" کی اصطلاح میں سوچتی ہے۔ جمال الدین افغانی، سید قطب، آیات اللہ خمینی، اقبال اور ابو الاعلیٰ مودودی وغیرہ کا طرزِ فکر زیادہ تر لوگوں کے ذہنوں پر چھایا ہوا ہے۔ چنانچہ یہ لوگ اسلامی کام کا مطلب یہ سمجھتے ہیں کہ موجودہ حکومتی نظام کو توڑ کر اقتدار پر قبضہ کیا جائے۔ اس کے بغیر اسلام کو زندہ نہیں کیا جا سکتا۔ میں نے ہر مجلس میں اس نقطۂ نظر کی مکمل تردید کی۔ میں نے کہا کہ "تغییرِ نظام" کا نظریہ کوئی نظریہ نہیں، یہ صرف ردِ فعل ہے۔

ایک عرب انجنیر نے بتایا کہ ہمارے ملک میں ۱۹۸۸ میں پٹرولیم انجنیرنگ پر ایک سمینار ہوا۔ اس میں یورپی ملکوں کے لوگ بھی بلائے گئے تھے۔ ان میں سے ایک ڈاکٹر برنر کیمبل (Burner Campbel) تھے جو ایل پی جی (Liquified petrolium gas) کے ماہر تھے۔ ان کو میں نے آپ کی کتاب "گاڈ ارائزز" پڑھنے کے لئے دی۔ اس کو پڑھنے کے بعد انھوں نے گہرا اتفاق کرتے ہوئے کہا کہ میں نے یہ جانا کہ اگر زمین پر کوئی مذہب واقعۃً منطقی مذہب (Logical religion) ہے تو وہ اسلام ہی ہو سکتا ہے۔ اور اگر کبھی مستقبل میں میں نے اپنا مذہب بدلنے کا فیصلہ کیا تو میں اسلام کا انتخاب کروں گا۔ انھوں نے گاڈ ارائزز کے بارہ میں اپنے تاثرات کا اظہار کرتے ہوئے کہا:

Even English speaking scientists in the west
can not write such a book on this subject.

اسلامی مرکز کی انگریزی مطبوعات کے سلسلہ میں اور بھی کئی لوگوں نے اعلیٰ تاثر کا اظہار کیا۔

کانفرنس میں ایک صاحب لندن سے آئے تھے۔ انھوں نے ایک مجلس میں خلیج کے مسئلہ کا ذکر کیا۔ وہ پرجوش طور پر صدام حسین کی وکالت کر رہے تھے۔ انھوں نے کہا کہ اس معاملہ میں بیشتر مسلمان صدام حسین کے حامی ہیں۔ جو لوگ مخالف ہیں وہ وہی لوگ ہیں جن کو سعودی عرب سے پیسہ ملتا ہے میں نے کہا کہ تنقید کا یہ طریقہ صحیح نہیں۔ جو حضرات صدام حسین کے حامی ہیں ان کے متعلق اگر یہ کہا جائے کہ ان کو عراق سے پیسہ ملتا ہے تو آپ اس کا کیا جواب دیں گے۔

میں نے کہا کہ صدام حسین کو اگر حملہ کرنا تھا تو انھوں نے اسرائیل پر حملہ کیوں نہیں کیا۔ کویت پر کیوں حملہ کیا۔ انھوں نے کہا کہ میں لندن میں عراق کے سفیر سے ملا تھا۔ میں نے پوچھا کہ آپ نے کویت پر کیوں حملہ کیا۔ سفیر نے کہا کہ اصل میں تو ہم اسرائیل پر حملہ کرنا چاہتے تھے، ہم نے سعودی عرب اور کویت سے کہا کہ اس معاملہ میں ہمارا ساتھ دو، مگر وہ ساتھ دینے کے لئے تیار نہیں ہوئے۔ اس لئے ہم کو ایسا کرنا پڑا۔ میں نے کہا کہ آپ کو سفیر عراق سے پوچھنا چاہئے تھا کہ جب آپ نے سعودی عرب اور کویت کی حمایت کے بغیر ایران اور کویت پر حملہ کر دیا تو اسی طرح آپ ان کی حمایت کے بغیر اسرائیل پر بھی حملہ کر سکتے تھے۔

پھر انھوں نے کہا کہ اصل بات یہ ہے کہ عراقی سفیر کے بیان کے مطابق، عراق کو یہ خطرہ تھا کہ جب وہ اسرائیل پر حملہ کرے گا تو امریکہ کی فوجیں خلیج میں عراق کے خلاف آجائیں گی۔ میں نے کہا کہ آپ کو عراقی سفیر سے دوبارہ کہنا چاہئے تھا کہ امریکی فوج تو کویت پر حملہ کی صورت میں بھی مکمل طور پر خلیج میں آگئی ہے۔ پھر جس طرح کویت پر حملہ کے وقت آپ نے امریکی فوج کی پروا نہیں کی، اسی طرح آپ اسرائیل پر حملہ کے وقت بھی امریکی فوج کی آمد سے بے پروا ہو کر اسرائیل کے خلاف اپنی فوجی کارروائی کر سکتے تھے۔

یہ ایک مثال ہے جس سے اندازہ ہوتا ہے کہ موجودہ زمانہ کے مسلمانوں کی سوچ کتنی زیادہ سطحی ہو گئی ہے اور مسلمانوں کے لیڈر کس طرح مسلمانوں کی کم فہمی کا استغلال کر رہے ہیں۔

۲ اگست ۱۹۹۰ کو صدام حسین نے کویت پر حملہ کر کے اس پر قبضہ کر لیا۔ اس کے بعد مسلمانوں کے مزاج کا جو پہلو سامنے آیا ہے وہ نہایت عجیب ہے۔ سنجیدہ اور سمجھ دار مسلمانوں کی ایک اقلیت نے اس کو صدام حسین کی جارحیت قرار دیا اور کھل کر اس کی مذمت کی۔ مگر دنیا بھر میں عام

سلمانوں کی اکثریت نے جارحیت کے مسئلہ کو نظر انداز کیا۔ وہ صرف یہ کہتی رہی کہ سعودی عرب نے کیوں امریکہ کو بلایا اور امریکہ کی فوجیں کیوں خلیج میں داخل ہوگئیں۔ چنانچہ موجودہ موتمر میں آنے والے لوگوں کی بیشتر تعداد کی سوچ بھی یہی تھی۔

یہ معاملہ موجودہ مسلمانوں کی ایک کمزوری کو بتاتا ہے۔ موجودہ مسلمان ہر معاملہ میں "بغض معاویہ" کی نفسیات کے تحت سوچتے ہیں۔ وہ "حب علی" کی نفسیات کے تحت سوچنے کی صلاحیت نہیں رکھتے۔ موجودہ زمانہ میں مسلمانوں کے زعماء، ان کے اخبارات، ان کے جلسے، صبح و شام صرف ایک بات کا اعلان کرنے میں مصروف ہیں۔ اور وہ "اعداء اسلام" کا مسئلہ ہے۔ ہر لکھنے اور بولنے والا صرف یہ خبر دے رہا ہے کہ اسلام دشمنوں نے ہمارے اوپر حملہ کر رکھا ہے اور ہمیں ان کے خلاف اٹھنا چاہئے۔

اس قسم کی باتوں نے مسلمانوں کے اندر مستقل طور پر "بغض معاویہ" کی نفسیات پیدا کر رکھی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ہر معاملہ میں ان کا طرز فکر منفی طرز فکر ہوتا ہے۔ اسی طرز فکر کا ایک مظاہرہ خلیج کے بحران کے سلسلہ میں ہوا ہے۔ مسلمان اگر معتدل نفسیات میں جی رہے ہوتے تو وہ اس معاملہ میں صدام حسین کی جارحیت کو سب سے زیادہ قابل مذمت چیز سمجھتے۔ مگر ان کی غیر معتدل نفسیات کا یہ نتیجہ ظاہر ہوا ہے کہ ان کی ساری توجہ صرف "دشمن اسلام" امریکہ کی کارروائی کی طرف چلی گئی، وہ صدام حسین کی خلاف حق کارروائی کو دیکھنے سے قاصر رہی۔

ایک تعلیم یافتہ عرب سے اس حدیث پر گفتگو ہوئی جس میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہے کہ لا الہ الا اللہ کے قول سے اپنے ایمان کی تجدید کرو (جددوا ایمانکم بقول لا الہ الا اللہ)۔ میں نے کہا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہے کہ تجدید کرو، یہ نہیں فرمایا ہے کہ تکرار کرو۔ یہاں جددوا کا لفظ تکرار کے معنی میں نہیں ہے بلکہ تفکیر کے معنی میں ہے۔ لا الہ الا اللہ ایک حقیقت ہے، بلکہ وہ سب سے بڑی حقیقت ہے، اس کی کوئی حد نہیں۔ جب بھی آپ اس پر غور کریں تو آپ اس میں نئی بات پائیں گے۔ پس حدیث کا مطلب یہ ہے کہ توحید کی حقیقت میں غور کرو، اس طرح تمہارا ایمان بڑھتا رہے گا:

ان الرسول صلی اللہ علیہ وسلم قال جددوا ولم یقل کرروا، فکلمة

"جددوا" ههنا ليس بمعنى التكرار بل بمعنى التفكير "لا إله إلا الله" هي حقيقة بل أكبر من كل الحقائق. فلا نهاية لها. وكلما فكرت فيها أدركت منها شيئاً جديدا. فمعنى الحديث: عليكم أن تتفكروا وتتفكروا في حقيقة التوحيد فتزدا معرفتكم.

ایک صاحب نے کہا کہ آپ اکثر اپنی تحریروں میں سائنٹفک نظریات سے اسلام کی صداقت ثابت کرتے ہیں۔ اگر بعد کو یہ سائنسی نظریات غلط ثابت ہو جائیں تو ایک شخص کہہ سکتا ہے کہ اسلام کی تعلیمات غلط ہیں۔ میں نے کہا کہ جو شخص اس قسم کی بات کرے اس سے آپ کو کہنا چاہئے کہ تمہارا اعتراض غلط ہے۔ تم اسلام کی اصل تعلیم کو دیکھو نہ کہ ایک شخص کی تفسیر کو۔ کیوں کہ جو چیز غلط ثابت ہوئی ہے وہ ایک شخص کی تفسیر ہے نہ کہ خود اسلام کا متن۔

دوسری بات یہ کہ یہ ایک ناقابل عمل چیز ہے۔ مثلاً قرآن میں ہے کہ اعدوا لهم ما استطعتم من قوة اس آیت کے بارہ میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ ألا ان القوة الرمي ألا ان القوة الرمي (قوت سے مراد تیر مارنا ہے، قوت سے مراد تیر مارنا ہے) یہ واضح طور پر آیت کی زمانی تفسیر ہے نہ کہ ابدی تفسیر۔ اگر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اپنے زمانہ میں یہ تفسیر نہ کرتے اور یہ سمجھ کر چھوڑ دیتے کہ آئندہ یہ تفسیر لوگوں کو غلط نظر آئے گی تو یہ حکمت کے خلاف ہوتا کیوں کہ تفسیر نہ کرنے کی صورت میں آیت کا وہ زمانی فائدہ حاصل نہ ہوتا جس کو حاصل کرنا ضروری تھا۔

ایک صاحب علم النفس کے ڈاکٹر تھے۔ انھوں نے کہا کہ انسان کے اخلاقی اوصاف میں کسی خارجی عنصر کا کوئی دخل نہیں ہے۔ وہ صرف کیمیائی عمل (chemical reactions) کے نتیجہ میں پیدا ہوتے ہیں۔ مثلاً نفرت اور محبت، معافی اور انتقام، دینا اور چھیننا، سب جسم کے اندر کیمیائی تبدیلیوں کے سبب سے ظہور میں آتے ہیں۔ میں نے کہا کہ اگر اس کو مان لیا جائے تو منطقی طور پر اس کا کوئی جواز نہیں رہتا کہ کسی مجرم کو سزا کیوں دی جائے۔ سزا کا تصور لازمی طور پر "ارادہ" کو تسلیم کرتا ہے۔ اگر کسی کے جرم میں اس کا اختیار اور ارادہ شامل نہ ہو تو اس کو اس کے کسی جرم پر سزا دینا کس طرح جائز ہوگا۔

ایک صاحب مغرب کے تعلیم یافتہ تھے۔ ان سے ڈارون کے نظریہ ارتقا پر گفتگو ہوئی۔ میں نے

کہا کہ میں ڈارونزم کو نہیں مانتا۔ وہ حیرت کے ساتھ میرا چہرہ دیکھنے لگے، انھوں نے کہا کہ ڈارون کا نظریہ ارتقا، تو ایک ثابت شدہ نظریہ ہے، پھر کس طرح آپ اس کا انکار کر سکتے ہیں۔

میں نے پوچھا کہ وہ کیسے ثابت شدہ ہے۔ انھوں نے کہا کہ اس نظریہ کے علما نے بندر سے لے کر انسان تک کے تمام ڈھانچے (اسکل) جمع کئے ہیں۔ ان کو سلسلہ وار رکھ کر دیکھنے سے معلوم ہوتا ہے کہ ان میں ایک تدریجی تبدیلی (Gradual change) ہوئی ہے۔ میں نے کہا کہ جس چیز کو آپ "تبدیلی" کہتے ہیں، اس کو اگر میں "فرق" کہوں تو آپ کے پاس اس کی تردید کی کیا دلیل ہوگی۔

یہ صحیح ہے کہ حیوانات کے درمیان بناوٹ کی مشابہت ہے۔ اسی طرح انسان اور حیوان کے ڈھانچہ میں بھی مشابہت ہے۔ مگر جب تک تجرباتی طور پر یہ ثابت نہ ہو جائے کہ ایک نوع سے دوسری نوع نکلی ہے، اس وقت تک ڈھانچہ کی اس مشابہت کو تبدیلی کی حیثیت نہیں دی جا سکتی۔ موجودہ حالت میں یہ مشابہت صرف فرق کو بتا رہی ہے۔ یعنی ہر ڈھانچہ اپنی ایک مستقل نوع کو بتا رہا ہے، نہ یہ کہ ایک سے دوسرا نکلا، دوسرے سے تیسرا اور تیسرے سے چوتھا۔ اور اس طرح ہوتے ہوتے انسان بن گیا۔ حقیقت یہ ہے کہ موجودہ نظریہ ارتقا کی بنیاد صرف خود ساختہ توجیہات پر ہے نہ کہ حقیقۃً مشاہدہ اور تجربہ پر۔

عربوں کی ایک مجلس میں موجودہ زمانہ کی مسلم تحریکوں کا ذکر آیا۔ میں نے کہا کہ موجودہ زمانہ کی تحریکیں آندھی کی طرح اٹھیں مگر نتیجہ کے اعتبار سے بے حقیقت ہو کر رہ گئیں۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ یہ تحریکیں لینے کے نام پر اٹھیں، جب کہ اس دنیا میں کامیابی اس کے لئے ہے جو دینے کے لئے اٹھے۔

سب سے پہلی تحریکیں وہ ہیں جو استعمار کے خلاف اٹھیں۔ وہ مغربی قوموں سے ان کی غالبیت چھیننا چاہتی تھیں۔ اسلام پسند تحریکوں نے مسلم حکمرانوں سے ان کا اقتدار چھیننے کا نشانہ دیا۔ فلپائن، برما، اریٹریا جیسے ملکوں کے مسلم لیڈر اپنے ملک کے غیر مسلم لیڈروں سے حق حکومت چھیننا چاہتے ہیں۔ ہندستان جیسے ملکوں کے مسلمان وہاں کے اکثریتی طبقہ سے یہ حق چھیننا چاہتے ہیں کہ وہ سڑکوں پر اپنا جلوس نکالیں یا اپنی مرضی کے مطابق اپنی زندگی کی تشکیل کریں۔

اس طرح موجودہ زمانہ کی تمام تحریکیں "چھیننے" کا نشانہ لے کر اٹھیں۔ مگر صحیح اسلامی تحریک وہ ہے جو دینے کے لئے اٹھے۔ جس کا مقصد دوسروں کو وہ چیز دینا ہے جو ان کے لئے مفید ہے۔ دعوت

الرسالہ فورم

۱۲۔ ۱۳ اکتوبر ۱۹۹۲ کو بھوپال میں علماء اور دانشوروں کا کل ہند اجتماع ہوا۔ اس اجتماع میں اتفاق رائے سے طے کیا گیا کہ الرسالہ مشن کے تحت ایک الرسالہ فورم قائم کیا جائے۔ اس کا مرکز دہلی میں ہو اور اس کی شاخیں ملک کے ہر شہر اور قصبہ میں قائم کی جائیں۔ الرسالہ فورم ایک غیر سیاسی فورم ہے۔ اس کا مقصد یہ ہے کہ تعمیری مزاج اور صحت مند سوچ رکھنے والوں کا حلقہ بنایا جائے۔ وہ ہر مسئلہ میں مثبت اقدامات کر کے یہ کوشش کریں کہ اجتماعی معاملات میں ٹکراؤ نہ ہو اور پر امن دائرہ میں مسئلہ کو حل کیا جا سکے۔

اس نمائندہ اجتماع نے تمام تعمیر پسند افراد سے اپیل کی ہے کہ وہ ہر مقام پر فورم بنانے اور مرکز دہلی سے اس کا الحاق کر کے اپنے اپنے یہاں یہ کام عملی طور پر شروع کر دیں۔ الرسالہ فورم حسب ذیل دائروں میں کام کرے گا۔

۱۔ دین حق کو حکمت اور موعظت حسنہ کے ذریعہ موثر اسلوب میں عام لوگوں تک پہنچانا۔

۲۔ لوگوں میں اخلاقی بیداری لانا اور انسانیت دوستی کا مزاج پیدا کرنا

۳۔ لوگوں کو صد فی صد تعلیم یافتہ بنانے کی کوشش کرنا۔

۴۔ معاشی حالت کو درست کرنے کی تدبیر اختیار کرنا۔

۵۔ لوگوں میں یہ مزاج پیدا کرنا کہ وہ اختلاف کے باوجود متحد ہو کر رہ سکیں۔

۶۔ باہمی جھگڑوں کو سمجھا بجھا کر ختم کرنا۔

۷۔ اپنے پڑوسیوں اور ہم وطنوں کے ساتھ مل جل کر رہنے کی تربیت کرنا۔

۸۔ فضول خرچی کو روکنا اور سادہ زندگی کو رواج دینا۔

۹۔ احتجاجی سیاست کے بجائے تعمیری سیاست کو فروغ دینا۔

۱۰۔ ہندو مسلم تعلقات کو بڑھانا اور باہمی اشتراک کی صورتیں اختیار کرنا۔

۱۱۔ فرقہ وارانہ مسائل میں جذباتی قیادت کی جگہ حقیقت پسندانہ قیادت وجود میں لانا۔ اور پریس اور پلیٹ فورم کی سطح پر مسلمانوں کی نمائندگی کو نیا تعمیری رخ دینا۔

اجتماع

پچھلے اعلان کے مطابق ، الرسالہ مشن اور اسلامی مرکز کے مقصد سے اتفاق رکھنے والوں
وسرا کل ہند اجتماع انشاء اللہ ہندستان کے تاریخی شہر بھوپال (مدھیہ پردیش) میں ہوگا۔
، اللہ اس میں صدر اسلامی مرکز شرکت کریں گے۔ اور مشن سے تعلق رکھنے والے دوسرے
اشخاص شریک ہوں گے۔

اجتماع کی کارروائی انشاء اللہ بھوپال کی مشہور مسجد صوفیہ میں ۲۲ اکتوبر ۱۹۹۲ کو بروز جمعرات
ہر کے وقت شروع ہوگی۔ اور ۲۴ اکتوبر بروز سنیچر نماز ظہر کے بعد ختم ہو جائے گی۔ شرکاء حضرات
کرم ۲۲ اکتوبر کو دوپہر سے پہلے صوفیہ مسجد (بھوپال) میں پہنچ جائیں۔

اس سلسلہ میں انفرادی دعوت نامے جاری نہیں کیے جا رہے ہیں۔ جو لوگ الرسالہ مشن سے
تہ ہیں اور اس سے اتفاق رکھتے ہیں وہ اس اعلان کو کافی سمجھیں اور مقررہ وقت پر بھوپال پہنچنے
کوشش کریں۔ صوفیہ مسجد بھوپال کے محلہ احمد آباد میں واقع ہے۔ ریلوے اسٹیشن سے مسجد صوفیہ کا
لہ تین میل ہے۔ اسٹیشن سے بذریعہ بس آنے والے لوگ اسپتال کے بس اسٹاپ پر اتریں۔
، اللہ گاڑی کا انتظام بھی رہے گا۔

جو لوگ اجتماع میں شرکت کا ارادہ رکھتے ہیں وہ اپنے اپنے مقام سے انفرادی یا اجتماعی
پر اپنی آمد کی اطلاع ناظم اجتماع بھوپال کو روانہ کر دیں تاکہ انتظامات میں آسانی ہو۔ جو لوگ
خط لکھ چکے ہیں وہ بھی ازراہ کرم دوبارہ ذیل کے پتہ پر اطلاعی کارڈ بھیج کر اپنی تعداد سے مطلع فرمائیں۔

اجتماع میں شرکت کا ارادہ رکھنے والے تمام حضرات کی طرف سے پیشگی اطلاع کا ملنا بہت
ری ہے۔ اطلاع بھیجنے کا پتہ اور ٹیلی فون نمبر یہ ہے :

ایم۔ وائی۔ فاروقی ، آفس سکریٹری الرسالہ اکیڈمی
ہاؤس نمبر ۳۰ احاطہ نور محمد خاں ، پیر گیٹ ، بھوپال (ایم پی)

M.Y. Farooqi, Office Secretary, Al-Risala Academy
30, Ahata Noor Mohammad Khan, Peer Gate, Bhopal 462001
Phone: (0755) 545956, 545948

عصری اسلوب میں اسلامی لٹریچر — مولانا وحید الدین خاں کے قلم سے

اردو

تذکیر القرآن جلد اول	200/-
تذکیر القرآن جلد دوم	200/-
اللہ اکبر	45/-
پیغمبر انقلاب	40/-
مذہب اور جدید چیلنج	45/-
عظمتِ قرآن	30/-
عظمتِ اسلام	6/-
عظمتِ صحابہ	6/-
دین کامل	50/-
الاسلام	40/-
ظہورِ اسلام	40/-
اسلامی زندگی	25/-
احیاء اسلام	20/-
رازِ حیات	60/-
صراط مستقیم	40/-
خاتون اسلام	45/-
سوشلزم اور اسلام	40/-
اسلام اور عصر حاضر	30/-
الربانیہ	40/-
کاروان ملت	45/-
حقیقتِ حج	30/-
اسلامی تعلیمات	25/-
اسلام دورِ جدید کا خالق	25/-
حدیثِ رسول	35/-
ڈائری جلد اول	95/-
ڈائری جلد دوم	
سفرنامہ (ملکی اسفار)	
سفرنامہ (غیر ملکی اسفار)	95/-
میوات کا سفر	35/-
قیادت نامہ	20/-
راہ عمل	25/-
تعبیر کی غلطی	50/-
دین کی سیاسی تعبیر	20/-
اقوال حکمت	20/-

انوار حکمت	20/-
تعمیر کی طرف	8/-
تبلیغی تحریک	20/-
تجدید دین	20/-
عقلیات اسلام	30/-
مذہب اور سائنس	20/-
قرآن کا مطلوب انسان	8/-
دین کیا ہے	5/-
اسلام دین فطرت	6/-
تعمیر ملت	6/-
تاریخ کا سبق	6/-
فسادات کا مسئلہ	5/-
انسان اپنے آپ کو پہچان	5/-
تعارف اسلام	5/-
اسلام پندرھویں صدی میں	5/-
راہیں بند نہیں	6/-
ایمانی طاقت	6/-
اتحاد ملت	6/-
سبق آموز واقعات	6/-
زلزلۂ قیامت	8/-
حقیقت کی تلاش	6/-
پیغمبر اسلام	5/-
آخری سفر	6/-
اسلامی دعوت	6/-
خدا اور انسان	6/-
حل یہاں ہے	10/-
سچا راستہ	5/-
دینی تعلیم	6/-
حیات طیبہ	6/-
باغ جنت	6/-
نارِ جہنم	6/-
خلیج ڈائری	10/-
رہنمائے حیات	6/-
شخصیات اسلام	–
تعدد ازواج	3/-

روشن مستقبل	6/-
صوم رمضان	6/-
علم کلام	6/-
صداقتِ اسلام	–
علماء اور دورِ جدید	–
ہندستانی مسلمان	6/-
سیرتِ رسول	
اسلام ایک عظیم جدوجہد	3/-
ہندستان آزادی کے بعد	1/-
مارکسزم تاریخ جس کو رد کرچکی ہے	7/-
سوشلزم ایک غیر اسلامی نظریہ	4/-
اسلام کا تعارف	2/-

ھندی

سچائی کی تلاش	6/-
انسان اپنے آپ کو پہچان	3/-
پیغمبر اسلام	3/-
منزل کی اور	3/-

عربی

الاسلام يتحدى	85/-
الاسلام والعصر الحديث	55/-

آڈیو کیسٹ

A-1	حقیقتِ ایمان	25/-
A-2	حقیقتِ نماز	25/-
A-3	حقیقتِ روزہ	25/-
A-4	حقیقتِ زکوٰۃ	25/-
A-5	حقیقتِ حج	25/-
A-6	سنتِ رسول	25/-
A-7	میدانِ عمل	25/-
A-8	پیغمبرانہ رہنمائی	25/-
A-9	اسلامی دعوت کے جدید امکانات	25/-
A-10	اسلامی اخلاق	25/-
A-11	اتحادِ ملت	25/-
A-12	تعمیر ملت	25/-
A-13	نصیحت لقمان	25/-

تذکیر القرآن کیسٹ (تلاوت، ترجمہ و تفسیر)

A-14	متفرق سورتیں ۱	/-
A-15	متفرق سورتیں ۲	/-
A-16	متفرق سورتیں ۳	

ویڈیو کیسٹ

V-1	پیغمبر انقلاب	0/-
V-2	اسلام داعیِ امن	0/-
V-3	اسلام دورِ جدید کا خالق	0/-
V-4	امتِ مسلمہ اور جدید چیلنج	0/-
V-5	اسلام اور سماجی انصاف	0
V-6	اسلام اور دورِ حاضر	0/-

d Arises	75/-
hammad	75/-
e Prophet of volution	
am As It Is	40/-
d Oriented Life	60/-
rds of the Prophet	–
roducing Islam	–
igion and Science	30/-
igh Movement	20/-
am the Voice Human Nature	–
am the Creator Modern Age	–
e Way to Find God	5/-
e Teachings of Islam	6/-
e Good Life	6/-
e Garden of Paradise	6/-
e Fire of Hell	6/-
n Know Thyself!	4/-
hammad The Ideal aracter	5/-
cial Justice in Islam	–
rds of Wisdom	–

فائل الرسالہ اردو (مجلد

2 سال	80/-
5	80/-
6	80/-
7	80/-
8	80/-
9	80/-
0	80/-
1	80/-

فائل الرسالہ انگریزی (مجلد

4 تا 1991 — 80/- فی جلد

فائل الرسالہ ھندی (مجلد)

0-91 — 85/-